یاد بسیرے
انور خان

# یاد بسیرے

افسانے

انور خان

تخلیق کار پبلشرز
۴۔۷، فراش خانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

افسانے : یاد بسیرے

مصنف : انور خان

پتا : ۴۸/۲۲ بی قمرالدین اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

سن اشاعت: ۱۹۹۰ء

قیمت : چالیس روپے 40/=

ناشر : انیس امروہوی

تخلیق کار پبلشرز، ۴۰۴، فراشخانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

سرورق : ایڈ گراینڈ ڈے

کتابت : ایم جمران اعظمی

مطبوعہ : رُوبی آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی ۶

ملنے کے پتے:

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس گلی وکیل، کوچہ پنڈت، دہلی ۶

اس کتاب کی اشاعت میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا جزوی مالی اشتراک شامل ہے۔

TP:02

KHAN, ANWAR

YAD BASEREY (STORIES)

TAKHLEEQKAR, DELHI

1990, PRICE: RS.40.00

# فہرست

# یادبسیرے

خورشید جتنے دن لندن میں رہا بمبئی کو یاد کرتا رہا کہ اُس کی جوانی کے حسین و خوش گوار لمحے اسی شہر کی سڑکوں پر، گلیوں میں گزرے تھے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ دورانِ پرواز اُس کا جہاز جوں جوں ہندوستان سے قریب آتا گیا، اُسے سورت کے قریب تاپی ندی کے کنارے بسے ہوئے اپنے گانو کی شدت سے یاد ستانے لگی چھوٹا سا خوش حال گانو جس کے ہر گھر کا کم از کم ایک فرد ضرور بمبئی، لندن یا افریقہ کے کسی شہر میں بسا ہوا تھا۔ گانو کی یاد کے ساتھ ہی شاندار پختہ مکانات، حویلیاں، بنگلے نظر سے گزرنے لگے۔ دس پندرہ سال گزارنے کے بعد جب بھی کوئی شخص گانو واپس آتا تو اُس زمانے کے فیشن کے مطابق اپنا مکان ضرور بنواتا اور یہ سلسلہ تقریباً سو سال سے چل رہا تھا۔ گانو کا کوئی مکان ایسا نہ تھا جو پختہ، رنگ و روغن سے آراستہ نہ ہو۔ بعض پرانی حویلیوں پر ایسی پچی کاری تھی کہ آدمی ٹھٹک کر دیکھنے لگے۔ گانو کی مسجد بھی اتنی ہی شاندار تھی اور وہ مدرسہ بھی جہاں اُس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ مدرسے کے مہتمم اپنے وقت کے جید عالم دین تھے جنھیں خاص طور پر بُلا کر رکھا گیا تھا اور ان کی رہائش کے لیے علیحدہ سے ایک خوبصورت مکان بنوا کر دیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں اُنھیں پانچ سو روپے تنخواہ دی جاتی تھی، جو گانو کی ضروریات اور اخراجات کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ جدید طرز کا اسکول تھا جس میں انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی اور ایک لازمی مضمون اُردو کا ہوتا۔ مادری زبان گجراتی ہونے کے باوصف لوگ اُردو بڑے شوق سے سیکھتے کہ یہ زبان انھیں ملک کے دوسرے مسلمانوں سے جوڑ دیتی تھی۔ اُردو اخبارات سورت سے آتے۔ گھر کی عورتیں خواتین کے اُردو ناول بڑے شوق سے پڑھتیں۔ خاطمہ مبین، اے۔ آر۔ خاتون، حجاب امتیاز علی اور بیگم عبدالقادر کے ناول گھر گھر موجود تھے۔ مردوں میں ایم۔ اسلم، رئیس احمد جعفری، انتصار حسین اور رشید اختر ندوی کے ناول

مشہور تھے۔ اسے یاد تھا کہ بچپن میں وہ ایک بار بمبئی گیا تھا تو اس کے ماموں نے اُسے تاکید کی تھی کہ وہ جیب اشعر کا ناول شہلا ضرور لیتا آئے۔ بے شمار ناموں میں سے یہ چند اُسے یاد رہ گئے تھے۔ ________________ اُس کے ماموں نے ایک دارالمطالعہ بھی قائم کیا تھا، جہاں لوگ شام میں جمع ہو کر اکثر حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال کرتے۔ دارالمطالعے کے لیے ہزاروں روپے کی کتابیں انھوں نے آپس میں چندہ کر کے بمبئی سے منگوائی تھیں۔ اُن میں اُردو کتابیں بھی تھیں، انگریزی بھی اور گجراتی بھی۔ لائف اور ٹائم کی مختلف سیریز کی کتابیں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں نہ صرف مطالعے میں موجود تھیں بلکہ کئی لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ خورشید کے والد تاریخی کتابوں کے دلدادہ تھے۔ تاریخ طبری، تاریخ فرشتہ، تاریخ آصفیہ، الفاروق، سیرۃ النبی وغیرہ کے پُرانے نایاب ایڈیشنوں کے علاوہ جادو ناتھ سرکار، ایشوری پرشاد، تارا چند اور ڈی پی مکرجی، مولانا آزاد وغیرہ کی کتابیں اُن کی لائبریری میں بڑے سلیقے سے رکھی رہتیں۔ چرچل اور جواہر لال نہرو کی انگریزی کے وہ دلدادہ تھے۔ انگریزی بہتر کرنے کے لیے وہ اکثر ڈسکوری آف انڈیا اور چرچل کی خود نوشت سوانح کا مطالعہ کرتے۔ تمام قیمتی کتابوں کی اُنھوں نے شاندار چمڑے کی جلدیں بنوائی تھیں جن پر مصنف اور کتاب کا نام زرّیں حروف میں کندہ ہوتا۔ خورشید جتنے دن گاؤں میں رہا ان کتابوں کو اِدھر اُدھر سے دیکھتا رہا۔ خوبصورت نفیس جلدیں اُسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ جلدوں پر کندہ کتابوں کے نام اُس نے سینکڑوں بار پڑھے ہوں گے۔ اب بھی آنکھیں بند کر کے وہ اُن میں سے چند ایک کے بارے میں تو کہہ ہی سکتا تھا کہ وہ لائبریری کے کس شلف میں کس مقام پر رکھی ہوں گی۔ لیکن کتابوں سے زیادہ مزہ اُسے اُن مجلسوں میں آتا تھا جو اکثر شام کو دیوان خانوں میں منعقد ہوتیں۔ عمر کے لحاظ سے ورنہ اس نے یا تو ابن صفی کے ناول پڑھے ہوں گے یا پھر تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے۔ بمبئی سے گاؤں کا کوئی شخص آتا یا پھر دُور دراز سے کسی کی واپسی ہوتی تو دعوتوں اور محفلوں کا ایک لمبا سلسلہ چلتا جو دنوں دن چلتا رہتا۔ بڑے بڑے شہروں کی باتیں، حیرت انگیز واقعات جو معلوم ہوتا تھا ان شہروں کا معمول ہیں اور ملکی سیاست کی باتیں وہ منہ کھولے، ایک ٹک، بغیر پہلو بدلے سنتا رہتا۔ زیادہ تر محفلوں کا اختتام سن رسیدہ، بوڑھوں کے اِن جملوں پر ہوتا کہ دنیا بہر حال فانی اور ناپائدار ہے اور آخرت کی تیاریاں کرنی چاہئیں۔ اصلی گھی میں تر تراتے خوشبودار چاولوں، میٹھی سویّوں یا

زردے اور دوسری مرغن غذاؤں کو طبیعت سے صاف کرنے کے بعد دانتوں میں خلال کرتے ہوئے ان جہاں دیدہ لوگوں کی زبان سے یہ باتیں جنہوں نے سچ مچ ایک دنیا دیکھی تھی اور ڈٹ کر دنیا داری کی تھی خورشید کو متبسم کر دیتیں۔ ایسی کتنی ہی باتیں اسے یاد آئیں۔

خورشید بمبئی ایرپورٹ پر اُترا تو اس کا ماموں زاد بھائی نجیب اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ برسوں بعد اپنے بچپن کے ساتھی سے ملتے ہوئے اسے بے حد خوشی ہوئی۔ اُس نے سوچا تو تھا کہ زیادہ وقت وہ بمبئی میں گزارے گا پھر کشمیر، دلّی اور آگرہ کی سیر کے لیے نکل جائے گا۔ لیکن جب اُس کی گاڑی ایرپورٹ سے باہر آئی اور اُس نے سڑکوں، گلی کوچوں، دکانوں اور مکانوں سے اُبلتے ہوئے ہجوم کو دیکھا، جگہ جگہ اُسے غلاظت کے ڈھیر اور جھونپڑ پٹیوں کی قطاریں نظر آئیں، تو اس کا دل گھبرانے لگا۔

"اِس شہر میں تو میں دو روز بھی نہیں رہ سکتا،" اس نے نجیب سے کہا۔ "چلو کل ہی گانو نکل چلتے ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" نجیب نے کہا۔ "کتنے ہی عزیز، رشتہ دار تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تقریباً سارے واقف کار بمبئی میں ہیں اور تم پندرہ سال بعد لندن سے لوٹ رہے ہو۔ دو چار دن تو رکنا ہی پڑے گا۔"

دو چار دن تو کیا تقریباً پندرہ دن ملنے ملانے میں ہی گزر گئے۔ اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اُس کے اتنے سارے عزیز و اقارب ہوں گے۔ ماموں، ماموں کے بچے، خالائیں، خالاؤں کی اولادیں پھر اُن کے بچے، چچا کے عزیز، بہنوں کے کنبے اور پھر اُن کے سسرالی رشتہ دار۔ دعوتوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ ہر شخص اپنے تموّل کو جتانے کا خواہشمند تھا کہ اگر تم نے سمندر پار دولت کمائی ہے تو ہم نے بھی بمبئی میں گھاس نہیں کھودی ہے۔ اگر خورشید سب کی دعوتیں قبول کر لیتا تو شاید ابھی اور دو مہینے اُسے بمبئی سے چھٹکارا نہ ملتا، بالآخر گانو سے واپسی پر اُس نے ان دعوتوں کو ٹالا۔ اسے یہ جان کر تعجب ہوا کہ اس کے رشتہ داروں میں سے گزشتہ دس پندرہ برسوں میں شاید ہی کسی کا گانو جانا ہوا ہو۔ خود نجیب کو بھی گانو دیکھے دس برس کے لگ بھگ ہو گئے تھے اور وہ بھی بس دوستوں کے ساتھ بطور پکنک ہی گیا تھا۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتا تو اس میں تعجب کی بات ہی کیا تھی۔ اُس نے خود دس سال بمبئی میں گزارے تھے اور شروع کے چند برسوں کے سوا اُس نے گانو کی طرف کبھی پلٹ کر

بھی نہیں دیکھا تھا۔

گانو چلنے کے لیے نہ اُس کی بیوی راضی ہوئی نہ بچے۔ اُن کے بڑے لمبے پروگرام تھے۔ پچاسوں ہندی فلمیں تھیں جو ابھی دیکھنی باقی تھیں۔ کچھ شہر کے مختلف سینما گھروں میں چل رہی تھیں، بقیہ ویڈیو پر دیکھنے کا پروگرام تھا۔ پھر پاکستان کے ٹی۔ وی ڈرامے تھے، شیطان کی آنت کی طرح طویل، ایک ڈرامہ "وارث" تو سات کیسٹوں میں تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ لوگ دو دو دن تک مسلسل یہ ڈرامے دیکھتے، پھر نئے کیسٹوں کی تلاش شروع ہو جاتی۔ اس کی بیوی تقریباً ہر سال ہندوستان آتی مگر اس کا سارا وقت یا تو بمبئی میں فلمیں دیکھنے اور شاپنگ میں گزرتا یا پھر وہ بچوں کو لے کر دلّی، اجمیر، آگرہ، جے پور کی سیر کو نکل جاتی۔ کبھی گرمیوں میں آنا ہوتا تو چند روز بمبئی میں گزار کر وہ سیدھی کشمیر چلی جاتی۔ گانو وہ بھول کر بھی نہیں گئی۔ اس کے ذہن میں گانو کا تصور بس اُس وقت کا تھا جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ عورتیں لمبے لمبے فراک پہنے، زیوروں میں لدی یا تو کھانے پکانے میں مصروف ہیں یا بچوں کے گو موت میں۔ عمر کچھ زیادہ ہوئی اور انھوں نے جانماز سنبھالی، منہ اندھیرے اُٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتیں پھر فجر کی نماز کے بعد وظیفے جو شروع ہوتے تو چاشت کے وقت تک چلتے رہتے۔ بات بات میں پاکی ناپاکی کا قضیہ شروع ہو جاتا۔ اپنا بچپن اُسے یاد آتا کہ جہاں کسی بڑھیا کے کمرے میں گھسی اور ہنگامہ ہوا۔ اے لڑکی کیا کر رہی ہے۔ ارری بھاگ ابھی سارا کمرہ دھلوانا پڑے گا۔ کرسیوں، میزوں تک کو غسل دیا جاتا تھا۔

چنانچہ خورشید کو نجیب کی معیت پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اُس نے سوچا اچھا ہے۔ اس طرح جھنجھٹ بھی کم ہی رہے گی۔ بمبئی سنٹرل جب وہ پہنچے تو ہجوم کو دیکھ کر اُسے بڑی وحشت ہوئی، مگر اُس نے خود کو تسلی دی کہ چند گھنٹوں میں بہر حال وہ اپنے گانو میں ہوگا۔ آدھ گھنٹے بعد پسنجر گاڑی نے پلیٹ فارم سے دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کیا اور کچھ دیر بعد بس ٹرین کی گھڑ گھڑ تھی اور ڈبے میں بیٹھے گجراتی مسافروں کی زور زور سے گفتگو کی آوازیں، جو ٹرین کے شور پر اپنی آواز کو فوقیت دلانے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اپنے سامنے بیٹھے مسافر تک بات پہنچ سکے۔ گھنٹہ ڈیڑھ ہوگیا اور وہ لوگ اسی جوش و خروش سے گفتگو کرتے رہے تو خورشید نے سوچا کہ ان لوگوں کا شمار شاید سب سے زیادہ بولنے والوں میں ہوتا ہوگا۔ اگر اس کی تصدیق ہو سکے تو وہ GUINEES BOOK OF RECORDS کے

مرتبین کو یہ بات لکھ کر بھیجیے۔ اِس خیال کا اظہار اُس نے نجیب سے کیا۔ نجیب ہنس پڑا۔

یہ باتیں ابھی چل ہی رہی تھیں کہ اگلے اسٹیشن پر دو گجراتی تاجر ڈبے میں داخل ہوئے اور انھوں نے گفتگو کا رُخ اشیا کے بھاؤ کی طرف موڑ دیا۔ ہینگ، دار چینی، مونگ پھلی اور پتہ نہیں کن کن چیزوں کا بھاؤ سنتے سنتے جس میں ہر مسافر شریک ہونا چاہتا تھا اور چیخ چیخ کر اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا خورشید کی طبیعت صاف ہوگئی۔ اُس نے سوچا یہ ریلوے کمپارٹمنٹ ہے یا شیئر بازار۔ اِس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا بس ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا۔ پسنجر گاڑی چونکہ چھوٹے سے چھوٹے اسٹیشن پر بھی دو چار منٹ کے لیے رک جاتی ہے وہ ہر اسٹیشن پر ڈبے سے اُتر جاتا۔ اس طرح کانوں کو کچھ راحت میسر آئی جو اس وقت اس کے لیے بے حد ضروری تھی۔

گاڑی جب اس کے گانو پہنچی تو سہ پہر شروع ہو چکی تھی۔ اپنے گانو کو دیکھ کر اُس کا دل کھل اُٹھا۔ سفر کی ساری کوفت، تمام تکان گانو کی فضا میں قدم رکھتے ہی جیسے ہوا ہوگئی۔ اسے لگا جیسے ابھی وہ دوڑ پڑے گا۔

گانو آج بھی ویسا ہی تھا۔ اُس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی کہ بمبئی سے یہاں تک سارے علاقے میں نہ ایسے مکانات نظر آئے نہ ایسی زرخیزی، پختہ مکانات نہ بنگلوں پر بمبئی کے مضافات کا گمان ہوتا تھا۔ اُس نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ نجیب اور وہ بس دو ہی مسافر تھے جو اسٹیشن پر اُترے۔ دوسرے مسافروں نے بھی انھیں کچھ عجیب نظروں سے تاکا تھا۔

اسٹیشن کے باہر ایک یکہ کھڑا نظر آیا۔ کسی زمانے میں یہاں تانگوں کی ریل پیل رہتی تھی مگر آج بس یہی ایک ٹوٹا پھوٹا برسوں پرانا یکہ دکھائی دے رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایک بوڑھا آگے بڑھا اور انھیں اس طرح دیکھنے لگا گویا وہ کوئی عجوبۂ روزگار ہوں۔

"پیسہ بہت لائے ہو؟" اُس نے اِن سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" نجیب نے ناگواری اور کچھ حیرت سے پوچھا۔

"پیسہ کمانے گئے تھے نا شہر؟" اُس نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو ۔۔۔ تو کیا ہوا؟" نجیب نے کہا۔

"ہم سمجھے بہت دھن کما لیا ہوگا۔ تبھی تو اتنی جلدی واپس چلے آئے۔"

خورشید اور نجیب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بوڑھا کچھ سنکی معلوم ہوتا ہے۔

"قاضی محلہ چلو گے؟" نجیب نے پوچھا۔

"قاضی محلّہ؟" اُس نے انھیں غور سے دیکھا۔ اس کی پتلیاں کچھ پھیلیں پھر سکڑ گئیں۔ "قاضی محلّہ" اُس نے پھر دوہرایا۔ پھر انھیں کچھ تعجب سے دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو بھلا وہاں بھی کوئی جاتا ہے۔ پھر خاموشی سے اگلی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا اور لگام ہاتھ میں لے لی۔

ایک بار پھر نظروں کا تبادلہ ہوا اور دونوں اُچھل کر تانگے پر چڑھ گئے۔ گھوڑا آہستہ آہستہ بڑھا گویا اب بھی کسی سوچ میں ہو۔ کچّے پکّے راستوں سے ڈُلکی چال چلتا گھوڑا گزرا تو ماحول بالکل شانت تھا۔ لمبی لمبی گھانس اور پیڑوں کی شاخوں کو جھلاتی ندی کی سبک ہوا بار بار خورشید اور نجیب کے بالوں کو بے ترتیب کردیتی۔ اور وہ بار بار ہاتھوں سے انھیں درست کرنے کی کوشش کرتے۔

"یہ رفیق چاچا کا گھر ہے۔" نجیب نے ایک دومنزلہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔

یکّہ مکان کے پاس سے گزرا تو خورشید نے دیکھا دروازے پر تالا پڑا ہے۔ مکان کا پینٹ اب بھی کچھ زیادہ ماند نہیں پڑا تھا۔ وہ اُس وقت تک مکان کو مڑ مڑ کر دیکھتا رہا جب تک مکان نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ اس کے بعد کئی مکان نظر آئے، کئی حویلیاں، مگر سب پر تالے پڑے تھے۔ ان کے مکینوں کے متعلق نجیب کو بھی پتہ نہیں تھا۔ شاید اُس کے بمبئی آنے کے بعد بنی تھیں۔ اُس کے بعد وہ راستہ آیا جو خورشید کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ فرلانگ بھر راستہ، جس کے دونوں طرف پیڑ تھے اور کچھ فاصلے پر ندی کنارے برگد کے کئی پیڑ اس طرح سایہ کیے ہوئے تھے کہ بچے دن بھر جھولا کرتے۔ گرمیوں کی راتوں میں بڑے بھی جمع ہوجاتے اور بڑے زوروں کے بحث مباحثے ہوتے۔ برسات میں گھروں سے پکوان بنواکر کئی کئی خاندان پکنک منانے پہنچ جاتے۔ خورشید نے دیکھا کہ وہاں سوائے سائیں سائیں کرتی ہوا کے کچھ بھی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ منظر بھی اوجھل ہوگیا۔

"یہ شوکت بھائی کا گھر ہے۔"

"وہ افریقہ والے۔"

"نہیں نہیں، اِن کے گھر والے سب بمبئی میں رہتے ہیں۔ والکیشور پر اُنھوں نے فلیٹ لے لیا ہے۔ یہ حمید دُودھ والے کا گھر ہے۔ اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہی لڑکا تھا وہ لندن میں ہے۔ کئی سال سے گھر بند پڑا ہے۔ یہ خیرو چاچی کی حویلی ہے اُن کے میاں اسّی تولہ سونا لے کر افریقہ سے آئے تھے۔ بھائی سارا سونا موس کر پاکستان لے گئے

اب اکیلی پڑی رہتی ہیں، چاچا پھر بھی اتنا کچھ چھوڑ گئے کہ گزر بسر ہو جاتا ہے۔"
یکّے کی گڑ گڑ گڑ سن کر ایک ضعیفہ پہلی منزل کی کھڑکی میں نمودار ہوئیں، خورشید نے بغور دیکھا۔ بڑھیا کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا، شاید وہ دکھ اور سکھ کی منزلوں سے بہت آگے جا چکی تھی۔

"یہ پیشِ امام صاحب کا مکان ہے نا؟" خورشید نے ایک مکان کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اُن کی لڑکی شکیلہ تو تمھیں یاد ہو گی؟"

"وہ جو سینٹ زیویرس کالج میں پڑھتی تھی؟"

"ہاں وہی" نجیب نے کہا۔ "تم تو جانتے ہو کہ اُسے ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔"

"مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ ہم لوگوں نے بہت چکّر کاٹے مگر وہ ہمیں کبھی خاطر میں ہی نہیں لائی۔"

"تمھیں پتہ ہو گا ایک پروڈیوسر نے اُسے فلم میں چانس دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"شاید اُس نے چند فلموں میں کام بھی کیا تھا۔"

"ہاں وہ چند سی کلاس فلموں میں آئی بھی۔"

"پھر، آج کل وہ کدھر ہے؟"

"ایک مارواڑی سیٹھ تولا رام کے پاس۔"

"شادی کر لی اُس کے ساتھ؟"

"پتہ نہیں۔"

خورشید کے ذہن میں پیش امام صاحب کی صورت گھوم گئی۔ کیسے نورانی بزرگ تھے، عالم دین۔ مذہب پر کیسی گہری نظر تھی۔ ہر جمعہ کو ظہر کی نماز کے بعد تفسیر بیان کرتے تھے۔

یکّہ اب محلّوں سے گزر رہا تھا۔ محلّے کے محلّے خالی۔ کہیں کوئی اِکّا دکّا آدمی نظر آجاتا۔ بچوں کا تو جیسے پتہ ہی نہ تھا۔ کبھی کبھار کہیں کوئی دکان نظر آجاتی۔ آٹھ دس مکانوں میں

کہیں ایک آدھ مکان کوئی کھُلا نظر آتا۔

"یار یہ سب محلے خالی پڑے ہیں کیا؟ مجھے تو ہول ہو رہا ہے۔" خورشید نے کہا۔

"گوالوں کا طبیلہ اب بھی ہے صاحب۔" یکہ بان پہلی بار بولا۔

"کتنے گوالے ہیں؟"

"بیس پچیس تو ہوں گے ہی۔" یکہ بان بولا۔ "گھاس ادھر بہت ہے اب تو گھسیارے بھی بہت آ گئے ہیں اس طرف۔"

"تو یہ سب بیچتے کس کو ہیں؟"

"ساب صبح گاڑی میں دُودھ چڑھا دیتے ہیں اور گھاس کے گٹھے بھی۔ سورت اور بمبئی کے بیوپاری اسٹیشن پر اُتار لیتے ہیں۔ اُن کا آدمی گاڑی میں گن کر نقد پیسہ دیدیتا ہے۔"

"اچھا۔"

یکہ ایک جانے پہچانے محلے میں داخل ہوا۔ اس گلی میں خورشید اور نجیب کی زندگی کے بیش قیمت سال گزرے تھے۔ گلی کے دونوں طرف پختہ شاندار مکانات آج بھی ایسے لگ رہے تھے جیسے ابھی ان کے مکین آئیں گے اور سارے محلے میں چہل پہل شروع ہو جائے گی ــــ خوبصورت مکانات جن کی تعمیر پر ان کے مالک فخر سے پھولے نہ سماتے تھے اپنے مکینوں کی راہ دیکھ رہے تھے۔ جو پتہ نہیں کن زمینوں میں دولت کی ذخیرہ اندوزی میں منہمک تھے۔ گلی جس میں دن بھر بچے اودھم کرتے رہتے تھے اس طرح سنسان دیکھ کر خورشید کا دل بیٹھ گیا۔

تانگہ خورشید کے مکان کے سامنے رکا اور وہ دونوں یکے سے اُترے۔ قریب کے ایک مکان کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا اور ایک بوڑھی عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ گلی کے کئی مکانوں کے نیم وا دریچوں سے اِکا دکا چہرے جھانکتے نظر آئے۔ خورشید کو کچھ خوف سا محسوس ہوا مگر ان کے خدوخال کچھ مانوس سے معلوم ہوئے۔ اس خرابے میں بھی رات بسر کی جا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا۔

"مکان کی چابی کس کے پاس ہوگی۔" نجیب نے کہا۔ "یہ تو ہم پوچھنا ہی بھول گئے۔"

ابھی وہ اِسی تذبذب میں کھڑے تھے کہ پاس کے مکان کی ایک کھڑکی سے ایک

جھرّیوں سے بھرا ہاتھ باہر آیا اور اُسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ خورشید کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ ایک عمر رسیدہ عورت کھڑکی میں کھڑی تھی جس کے بال سن سے زیادہ سفید تھے۔

"غیاث الدین کے لڑکے ہو تم؟" باریک، منمناتی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اُس نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔ تبھی اس کے ذہن میں مانوس خد وخال کا ایک شاداب چہرہ اُبھرا۔ ارے یہ تو شاہدہ خالہ ہیں۔

"شاہدہ خالہ!" اس نے چلّا کر کہا۔

"پہچان لیا مجھے۔" عورت نے مسرت سے کہا۔ "ٹھہرو، میں چابی بھیجتی ہوں۔"

یکے بعد دیگرے مختلف دریچوں سے کئی بوڑھے چہرے نمودار ہوئے اور اُنھوں نے اپنی پہچان کروائی۔

ارے یہ تو فدا علی ہیں جن کی بمبئی میں تالوں کی دکان تھی۔

ابراہیم جناب جنھوں نے انھیں پرائمری اسکول میں پڑھایا تھا۔

رحمت آپا جن کے دروازے سے برات لوٹ گئی تھی کیونکہ دولھا کی عمر بہت زیادہ تھی۔

مولوی بشیر الدین جن کی کتابوں کی دکان تھی۔ تقریباً ہر شام ابّا سے ملنے آتے تھے۔

چہرے جن پر وقت جالے تان چکا تھا مگر اب یہ گلی کچھ زیادہ مانوس سی لگنے لگی۔ یہ اُس کا اپنا محلّہ تھا وقت نے اس کے ساتھ بھلے ہی جو بھی سلوک کیا ہو۔

شاہدہ خالہ نے دریچے سے چابی پھینکی۔

"بھابی کا خط آیا تھا،" اُنھوں نے کہا۔ "کمرے صاف کروا دیے ہیں۔ رات میں کھانا بھجوا دوں گی۔ فکر مت کرنا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو منگوا لینا۔"

اپنے مکان کا تالا کھولتے ہوئے اُس کے ہاتھ بُری طرح کانپے۔ نجیب نے اُس کے ہاتھ سے چابی لی اور خود دروازہ کھولا۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ دیوان خانہ، ابّا جان کے مطالعے کا کمرہ، کچن، زنانے کمرے، یہ امّی کا پلنگ، یہ ابّا جان کی میز۔ یہ اُس کا اپنا کمرہ۔ کپ بورڈ میں کپڑے اب بھی اس سلیقے سے رکھے تھے گویا امّی نے ابھی ابھی تہہ کر کے رکھے ہیں۔ اُس نے اپنی میز کی ایک دراز کو کھولنے کی کوشش کی۔ دراز جام ہو گئی تھی۔ اس نے پوری قوت سے کھینچا۔ اندر اُس کی چیزیں اب بھی

ویسی کی ویسی رکھی تھیں۔ پنسلیں، ربڑ، قلم، اسکول کی کاپیاں۔ میز پر اب بھی ابن صفی کے کئی ناول دھرے تھے۔ اس نے ایک کپڑا لے کر گرد جھاڑی۔ آدھی سے زیادہ کتاب دیمک چاٹ گئی تھی۔ ابا جان کی کتابیں کس حالت میں ہوں گی۔ وہ اُن کے مطالعے کے کمرے میں آیا۔ خوب صورت جلدیں اب بھی اُسی نفاست سے سجی تھیں۔ بمبئی سے چلتے وقت اُس نے سوچا تھا کہ ان کتابوں کو کسی یونیورسٹی یا اچھی لائبریری کو دے دیگا۔ کپڑے سے اس نے کتابوں کو جھٹکا۔ اور گرد کی تہہ کچھ چھٹی۔ سُنہری حروف کچھ اُجاگر ہوئے۔ "کیمیائے سعادت، کلیاتِ میرؔ، دیوانِ داغؔ، دیوانِ غالبؔ، مکتوباتِ ربانی، کتاب الشفاء"

اُس نے "کیمیائے سعادت" کو انگلیوں کے دباؤ سے کھینچ کر باہر نکالا۔ دیمک نے جگہ جگہ سُوراخ کر دیے تھے۔ اُس نے کتاب واپس اپنی جگہ پر رکھ دی۔ اور ایک دوسری کتاب نکالی یہ کلیات میرؔ کا ایک بہت پُرانا ایڈیشن تھا۔ دیمک اس پر بھی قابض ہو چکی تھی۔ اُس نے صفحات پلٹے۔ مگر جو صفحہ ہاتھ میں لیتا وہ ہاتھ لگاتے ہی مٹی کی طرح بھربھرا کر جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتا۔ خورشید نے اُسے بھی واپس رکھ دیا۔ دیوانِ غالبؔ کا جرمن ایڈیشن اُسے نظر آیا۔ شاید اس کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا۔ اُس نے اوراق پلٹے۔ اس کی بھی وہی کیفیت تھی۔ جہاں انگلیاں مس ہوئیں اور صفحات جھڑ جھڑ کر ٹوٹنا شروع ہو گئے۔ لندن میں اس سے کسی نے کہا تھا، ہندوستان میں تاریخ فرشتہ کا کوئی نسخہ ملے تو ضرور لانا اور اس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ یہ کتاب تو اس کے والد کی لائبریری میں موجود ہے۔ اُس نے کتابوں کے درمیان تلاش کرنا شروع۔ پتہ نہیں اس کتاب کا کیا حال ہوگا۔ تاریخ کی کتابوں میں تلاش کرتے ہوئے اُسے تاریخ فرشتہ نظر آ ہی گئی۔ اُس نے بڑے اشتیاق سے کتاب نکالی۔ دوسری کتابوں کی طرح اُسے بھی دیمک لگ چکی تھی۔ اُس نے صفحات پلٹے مگر وہی کیفیت کہ انگلیاں لگتے ہی صفحات بھربھرا کر ٹوٹ جاتے۔ اُس نے بے دلی سے کتاب میز پر ڈال دی۔ اُسے یاد آیا، بچپن میں اُس نے سُنا تھا کہ ۱۹۴۴ء میں بمبئی کی بندرگاہ پر ایک نیوی کے جہاز میں جس میں بموں کا ذخیرہ تھا آگ لگی تھی اور بمبئی دہل گئی تھی۔ بموں کے دھماکوں سے دور دور تک بلڈنگیں کانپ گئی تھیں۔ کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہو گئے تھے۔ لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے تھے۔ گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مارواڑیوں کی تجوریوں میں نوٹوں کی گڈیاں بظاہر جوں کی توں نظر آتیں مگر ہاتھ لگاتے ہی مٹی ہو جاتیں۔ یہ قیمتی ذخیرہ بھی اب مٹی ہو چکا۔ اس نے کتابوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہ دیوان خانے میں آیا۔ نجیب بستر پر لیٹا سفر کی تکان دور کر رہا تھا۔ رات میں شاہدہ خالہ کی طرف سے کھانا آیا۔ اور دونوں نے خاموشی سے زہر مار کر لیا۔ اس کے بچپن میں اِسی مکان میں جب دسترخوان بچھتا تھا تو دس پندرہ افراد سے کم نہ ہوتے۔ کیسی چہل پہل رہتی تھی۔ اُس کی یادوں نے پل بھر میں ساری حویلی روشن کر دی۔ فانوس جگ مگ کرنے لگے۔ آراستہ صاف ستھرے کمرے جگ مگ کرنے لگے۔ کہیں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹیں، کہیں یہ لاؤ، وہ لاؤ، یہاں آؤ، وہاں جاؤ کی صدائیں۔ یہ پلاؤ کی پلیٹ ذرا اُٹھانا۔ ہاں یہ میٹھے چاول یہاں رکھ دو کیسی خوش گپیاں رہتی تھیں۔ قہقہے، چہلیں، صدائیں نصیحتیں۔ پھر ایک دم سے اندھیرا ہو گیا۔ در و دیوار پر ویرانی برسنے لگی۔

"کمال ہے کسی نے ہمیں بتایا ہی نہیں کہ گانو کی حالت اِس قدر بدل گئی ہے۔" نجیب نے کہا۔

"کوئی آتا ہی نہیں اِس طرف۔" خورشید نے کہا۔

"بھولے بھٹکے کوئی چلا بھی آتا ہوگا تو فوراً واپس چلا جاتا ہوگا۔" نجیب نے کہا۔

خورشید نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ لیمپ سارے روشن تھے۔ سنسان گلی میں اُجالا کچھ عجیب سا سماں پیدا کر رہا تھا۔ مکانات اب بھی جیسے منتظر تھے۔ ندی کی طرف سے ہوا کے تیز جھونکے آئے، مکانوں کی کنڈیاں ہلیں۔ کہیں کوئی کھڑکی کا پٹ ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر ناگوار سا شور کرنے لگا۔ تبھی خورشید کے کانوں کو کچھ التباس سا ہوا کہ بہت سارے لوگ گانو کی طرف آ رہے ہیں۔ شاید اب سب گٹھریوں میں سونے اور چاندی کے ذخیرے باندھے واپس آ رہے ہوں گے۔ اُس نے سوچا۔ سارے مکانات کے دروازے کھل جائیں گے۔ حویلیاں روشن ہو جائیں گی۔ گلی بچوں کی صداؤں سے چہک اُٹھے گی۔ مگر کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ہواؤں کے جھکڑ بند مکانات سے ٹکرا ٹکرا کر بکھرتے رہے۔

شاہدہ خالہ کی ملازمہ برتن اُٹھانے آئی تو خورشید نے اُس سے پوچھا۔

"تم لوگوں کے لیے سودا سلف کون لاتا ہے؟"

"گوالے دودھ دے جاتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ "پیر کو گواوں کی طرف بازار لگتا ہے تو ہم لوگ جا کر سامان لے آتے ہیں۔ ابراہیم جناب اور مولوی بشیر سب کے گھر کا سودا سلف لکھ لیتے ہیں۔ آپ یہاں کتنے دن رہیں گے؟"

خورشید اور نجیب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور بے چینی سے پہلو بدلے۔ خورشید مراقبے میں چلا گیا۔

"خالہ نے پوچھا ہے۔" ملازم نے اُنھیں تردّد میں دیکھ کر کہا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ اس سوال کا جواب ضروری ہے۔

خورشید مراقبے سے باہر آیا۔ اُسے لگا کہ کمرے کی دیواریں اُس سے کہہ رہی ہیں کہ کم از کم تم تو ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔ سب چلے گئے۔ بس تم ہی واپس آئے ہو۔ تمھارے بعد یہاں کون آئے گا۔

"تمھیں جواب ابھی چاہیے؟ اِسی وقت؟" نجیب نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں نہیں، ہم کل صبح چلے جائیں گے۔" خورشید جلدی سے بول پڑا۔ کہیں سچ مچ یہ دیواریں اُسے روک نہ لیں۔

سویرے ناشتہ کر کے وہ نکلے تو خاصا اُجالا ہو چکا تھا۔ نجیب دروازے کو تالا لگا رہا تھا کہ وہی کل والا تانگہ ٹخ ٹخ کرتا گلی میں داخل ہوا۔

خورشید نے نجیب کو سوالیہ نگاہوں سے تاکا۔

"میں نے تو نہیں کہا تھا۔" نجیب اُس کی نظروں کو سمجھ کر بولا۔ "شاید شاہدہ خالہ نے کہلوایا ہوگا۔"

تانگہ ان کے قریب آکر رُک گیا۔ بوڑھے کوچوان کی نگاہوں نے کہا میں جانتا تھا کہ تم لوگ نہیں رُک سکوگے۔ وہ دونوں تانگے میں بیٹھے اور اُس کی نگاہیں اچانک ایک مکان کے کھلے دریچے پر جا کر ٹھہر گئیں۔ اُس کے ذہن میں شاید کوئی دریچہ وا ہوا اور ایک معصوم تیرہ چودہ سال کی لڑکی نے گلی میں جھانکا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔ تیکھے نقوش، معصوم سا گورا گورا چہرہ۔ کیسی معصوم محبت تھی۔ جتنی دیر وہ گلی میں رہتا سورج مکھی کے پھول کی طرح وہ بس اُس کے چہرے کو تکتی رہتی۔ لندن میں، ڈربن میں، بمبئی میں یہ چہرہ اُسے کتنی ہی بار یاد آیا تھا۔ یہ محبت جس میں کوئی غرض نہ تھی، کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ ابھی تو اُنہیں محبت کے معنی بھی معلوم نہ تھے۔ اُسے بس اتنا احساس تھا کہ یہ لڑکی ہمیشہ اس کی طرف دیکھتی رہتی ہے وہ کبھی جھینپتا کبھی جھنجھلاتا مگر جیسے ہی وہ مکان کے باہر قدم رکھتا اس کی نگاہیں خود بخود اُسے تلاش کرنے لگتیں۔ ابھی وہ اس جذبے کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ ایک روز گلی میں

شہنائیاں بجیں۔ گیس کے ہنڈولوں سے سارا محلہ روشن ہوگیا۔ مکان پھولوں کی لڑیوں سے ڈھک گئے۔ سہرے میں ڈھکا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے زینے سے اُترا، گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک آخری وحشت بھری بے چین نظر اُس نے خورشید پر ڈالی اور تھوڑی ہی دیر میں پھولوں سے سجی موٹر اُسے لے کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

ایک ادھیڑ عورت کا چہرہ کھڑکی میں نمودار ہوا۔ کیا یہ وہی تھی؟ مگر نہیں وہ اُسے پہچان نہیں سکتا۔ اب تو وہ خدوخال بھی ذہن میں دھندلا چکے تھے۔ دو آنکھیں اُسے تک رہی تھیں، وہ مسکرایا۔ ادھیڑ عمر عورت بھی مسکرائی اور تانگہ ایک ہلکے سے دھچکے سے چل پڑا۔ خورشید کا چہرہ خود بہ خود گھوم گیا۔ بند مکانات، بند دروازے، بند کھڑکیوں کے درمیان نیم وا دریچوں سے کہیں کہیں کچھ بوڑھے چہرے اُسے تک رہے تھے۔ ایک ایک شے کو اس نے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں محفوظ کرلینا چاہتا ہو۔ تانگہ مڑا تو اُسے محسوس ہوا جیسے ادھیڑ عمر عورت اُسے دیکھنے کے لیے جھک گئی ہے۔ اُس نے یونہی ہاتھ ہلادیا، جواباً لحظہ بھر کے لیے اُسے ایک ہاتھ ہلتا محسوس ہوا یا یہ محض اس کا گمان تھا؟

ایک بار پھر وہ خوب صورت، پختہ، شاندار مکانوں کے درمیان سے گزرے۔ اس بستی کے مکین کن زمینوں میں کھوگئے؟ عمارتوں کا جھنڈ دور ہوتے ہوتے بالآخر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ خورشید نے ایک لمبا سانس لیا اور پشت سے ٹیک لگاکر آنکھیں بند کرلیں۔

کوچوان گھوڑے کو بار بار پھٹکارتا مگر وہ یکساں رفتار سے چلتا رہا۔ ایک موڑ کاٹ کر جیسے ہی وہ پلیا پر آئے ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کے اثر سے خورشید نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ندی پر سے گزر رہے تھے۔ یہ ندی، یہ پیڑوں کا جھنڈ، یہ پرندے، یہ موسم، یہ فضا سب کچھ ویسا ہی ہے۔ جیسا ہمیشہ سے تھا۔ خورشید نے سوچا۔ اور جھک کر ندی میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس ندی کو زندگی میں آخری بار دیکھ رہا تھا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کئی پتے شاخوں سے جُدا ہوکر فضا میں ڈولنے لگے۔ ایک پتہ لہراتا ڈولتا خورشید کی گود میں آگرا۔ اس نے عقیدت سے پتے کو ہاتھ میں لیا اور اُس کی چکنی شفاف سطح پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ نجیب ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ اس پتے کو آنکھوں سے لگالیتا۔ اُس نے اپنے سفری بیگ کی زپ کھولی، نجیب کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔ اس نے پتے کو قمیضوں کے درمیان رکھ کر سفری بیگ بند

کر دیا۔

چند منٹوں بعد ندی بھی پیچھے رہ گئی۔ خورشید نے مڑ کر دیکھا، اُسے ایک درخت کے نیچے چند بچے کھیلتے نظر آئے۔ ایک لحظے کے لیے اُسے محسوس ہوا جیسے اب بھی وہ اس درخت کے نیچے کھیل رہا ہے اور وقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھم گیا ہے۔ پھر وہ درخت بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

گھوڑے نے پھریری لی اور تیزی سے دوڑنے لگا جیسے جلد از جلد اسٹیشن پہنچ جانا چاہتا ہو۔

# پوز

چلتے چلتے پتہ نہیں کیا سنک سوار ہوئی کہ وہ شاندار کلاتھ اسٹورس میں داخل ہوئی اور شو کیس کا دروازہ کھول کر اور اس میں رکھے پلاسٹک کے خوبصورت ماڈل کو ہٹا کر خود اس جگہ پر اسی انداز میں کھڑی ہو گئی۔

شام کا وقت تھا۔ بھیڑ بہت تھی لیکن لوگ اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے اس لیے اس کی اس حرکت پر کسی کی نظر نہ پڑی۔

ایسا اس نے کیوں کیا؟ شاید اس وقت اس سے پوچھا جاتا تو وہ خود بھی نہ بتا پاتی۔ بچپن میں اس نے کافی شرارتیں کی تھیں مگر اب تو وہ ایک شائستہ سلجھی ہوئی سمارٹ کالج اسٹوڈنٹ تھی جس سے گفتگو کرتے ہوئے کالج کے لڑکے بھی ٹھٹکتے تھے۔ یہ حرکت تو اس سے بس یوں ہی سرزد ہو گئی تھی۔

شو کیس میں کھڑے ہوئے اسے بڑی راحت ملی۔ اب وہ بہر حال اس بھرے بازار کا ایک حصہ تھی اور ایک جگہ کھڑے رہ کر سارے بازار کا جائزہ لے سکتی تھی۔ بھیڑ میں چلتے ہوئے گوناگوں سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے اسے کبھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ بھی اپنے پاس سے گزرتی بھری پری جیتی جاگتی جگمگاتی زندگی کا جز ہے۔ اس کے بدن کا تناؤ کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو گیا چہرے پر خود بخود مسکراہٹ کھیل گئی۔ ایک پیر کو ذرا سا آگے بڑھا کے، ساڑی کے پلو کو سر پر سے گزارتے ہوئے داہنی کہنی کے موڑ پر پلو لپیٹ کر اس نیم دلربا انداز میں کھڑا رہنا اسے خود ہی بھلا لگ رہا تھا۔ اس طرح تو وہ عمر بھر کھڑی رہ سکتی ہے۔ اس سمے کی موج میں اس نے سوچا اگرچہ اس کے پیر کی ایڑیوں نے ابھی سے احتجاج شروع کر دیا تھا۔

ابھی پیروں کو آرام دینے کا اس نے سوچا ہی تھا کہ ایک دیہاتی فٹ پاتھ سے گزرتی بھیڑ

سے علیحدہ ہوکر شوکیس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اور اسے بڑی ندیدی اور متحیر نگاہوں سے گھورنے لگا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ یہ کاریگر بھی کمال کرتے ہیں۔ ایسی مورتیں بناتے ہیں کہ اصل سے ملا دیتے ہیں۔

خیریت ہوئی کہ شیشے کی دیوار دونوں کے بیچ حائل تھی ورنہ یہ گنوار اُسے یقیناً چھو کر دیکھتا۔

دیہاتی کا ارادہ ممکن ہے کچھ دیر اور رُکنے کا ہو مگر آس پاس سے گزرتے ہجوم کی تیز نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اسے کھسکتے ہی بنی۔ دیہاتی کے جاتے ہی اس نے پیروں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ انہیں تھوڑی حرکت بھی دی مگر اب ہونٹ نہ جانے کیوں خشک ہونے لگے تھے۔ "تھوڑی دیر اور" اس نے اپنے ہونٹوں سے زیرِ لب کہا۔ "پھر ہم جلد ہی کسی ہوٹل میں پانی اور چائے سے آپ کی خاطر کریں گے۔" تشنگی کا احساس کچھ زائل ہوا اور وہ پھر اپنے سابقہ پوز میں کھڑی ہوگئی۔

اس بات کی اسے یقیناً کوئی خواہش نہ تھی کہ راستے سے گزرتے ہوئے لوگ اسے اس طرح کھڑے ہوئے دیکھیں۔ ایسا شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اسے تو بس اس بات کی خوشی تھی کہ اب وہ گرد و پیش کی زندگی میں برابر کی شریک تھی۔ ایک ایسا احساس جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"او گاڈ" اچانک دو کالج کی لڑکیاں اسے دیکھ کر چیخ پڑیں۔ "ہاؤ لائف لائک۔"

ان کی آواز شیشے کے اطراف لوہے کی پٹیوں کے سوراخوں سے گزرتی ہوئی بہت ہلکے سے اس سے ٹکرائی جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔

دونوں لڑکیاں کچھ دیر تک اسے ستائشی نظروں سے دیکھتی رہیں اور آپس میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں اور وہ انہیں اسی طرح میٹھی محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ وہ خوش تھی۔ بہت خوش۔ اس طرح اس کا نوٹس شاید ہی کسی نے لیا ہو۔ کم از کم اس کے سامنے تو نہیں۔ وہ ایک مہربان ملکہ کی طرح جو اپنی رعایا سے خراجِ عقیدت حاصل کر رہی ہو یونہی کھڑی رہی یہاں تک کہ وہ کالج کی لڑکیاں پھر بھیڑ میں شامل ہو کر نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

اب کون آتا ہے؟ اس نے سوچا۔

اس کے پیر پھر احتجاج کرنے لگے تھے۔ مگر اس بار اس نے تنبیہی احکام بھیجے کہ کم بختو سیدھے کھڑے رہو۔ تم سے ذرا سا صبر بھی نہیں ہوتا؟ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ان کے احتجاج پر بالکل

غور نہیں کرے گی۔

اسے اپنے فیصلے پر اطمینان ہوا کہ اس نے دیکھا کہ ایک سپاہی جو بھیڑ سے علیحدہ ہو کر تمبا کو کی ڈبیا سے، ہتھیلی پر تمباکو چھڑک کر انگوٹھے سے مسل رہا تھا اسے دیکھتے دیکھتے رک گیا ہے اس کے ہونٹ کھلے رہ گئے ہیں اور آنکھیں پھیل گئی ہیں۔ اس نے سپاہی کو بڑی میٹھی نگاہوں سے تاکا اور سپاہی کی پلکیں تیزی سے جھپکنے لگیں اس نے تمباکو کو جلدی جلدی مسلا اور نچلے ہونٹ اور دانتوں کے درمیان ٹھونس کر شوکیس کے شیشے سے آنکھیں تقریباً چپکا دیں۔

اسے بڑے زور کی ہنسی آئی۔ اور وہ بڑی مشکل سے خود کو روک پائی۔ پیر بڑے زوروں سے کھجلانے لگے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی ان میں خفیف سی لرزش ہوئی مگر سپاہی شاید اس کو اپنی نظر کا التباس سمجھا یا تمباکو کے نشے کا اثر۔

سپاہی بڑی دیر تک اسے گھورتا رہا۔ گھوم پھر کر وہ بار بار اسے تکنے لگتا۔ یہاں تک کہ اسے الجھن ہونے لگی کہ یہ منحوس اب جائے گا بھی یا یونہی کھڑا رہے گا۔ کیونکہ اس طرح ایک ہی پوز میں کھڑا رہنا اب اسے بہت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ یہ بات البتہ اطمینان بخش تھی کہ وہ شوکیس میں بالکل محفوظ ہے۔ تحفظ کا یہ احساس باہر کہاں؟

خیر خدا خدا کر کے سپاہی ٹلا اور اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاتھوں اور پیروں کو راحت دی۔ کمر سیدھی کی۔ بلکہ دونوں ہاتھوں سے دبا کر اسے آرام بھی دیا۔ شام ڈھل رہی تھی اور ہجوم کم ہو گیا تھا۔ بس اکّا دکّا آدمی تیزی سے گذر جاتا۔

جلد ہی اندھیرا ہو جائے گا اور اس سے پہلے اسے نکل جانا چاہیئے۔ اسٹور میں بھی اب بھیڑ کم ہو گئی ہو گی۔ ممکن ہے اسے باہر نکلتے ہوئے کوئی دیکھ لے اسے بڑی تیزی سے نکلنا ہو گا۔ مگر شوکیس میں کتنا آرام تھا اور کس قدر لطف آ رہا تھا؟ بس دس منٹ اور

وہ ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی سہیلی شیاما فٹ پاتھ پر سے گذرتی نظر آئی اور وہ جلدی سے اپنے پہلے پوز میں آ گئی۔ اس کی سانس رک سی گئی۔ شیاما نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی لیکن شاید اس کا ذہن کہیں اور تھا اور یہ خطرناک لمحہ بھی ٹل گیا۔ یہ خیال اسے اب تک نہیں آیا تھا کوئی واقف کار اسے یہاں دیکھ سکتا ہے۔ بڑے بھیا بھی تو اس وقت دفتر سے لوٹتے ہیں۔ دل کے مریض تو وہ ہیں ہی اور گھر کی عزت کو اس طرح سر بازار دیکھ کر تو ان کی روح ہی پرواز کر جائے گی۔

دو بچے اس کی آنکھوں کے فوکس میں آئے ۔ وہ اسکول سے لوٹ رہے تھے ۔۔۔ بستے ان کی پشت سے چپٹے ہوئے تھے۔ بچوں نے اسے بڑی دل چسپی سے دیکھا اور اپنی آنکھیں ناک اور ہونٹ سمیت شیشے سے لگا دیں۔

"اببے اصلی ہے"، ایک بچے کی بڑی مدھم سی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اُسے پھر ہنسی آنے لگی۔

"پلاسٹک کی ہے بے بدھو،" دوسرے بچے نے کہا۔ "اصلی ماڈل بھی کہیں رکھا جاتا ہے،"

"لیکن یار بالکل اصلی لگتی ہے، ایسا لگتا ہے ابھی بول پڑے گی۔"

"شام ہو رہی ہے نا اسی لیے،" دوسرے بچے نے کہا، روشنی ٹھیک ہوتی تو ابھی معلوم ہو جاتا۔"

"ہلو،" بچے نے شرارتی لہجے میں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

دوسرا بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے بھی ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کہا اور دونوں اس کی آنکھوں کے فوکس سے باہر ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنسی مگر فوراً ہی بوکھلا گئی۔

شیشے کے باہر ایک نوجوان اسے حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ملتے ہی وہ مسکرایا۔ اپنی بوکھلاہٹ چھپانے کی خاطر وہ بھی مسکرائی۔ اس نے جلدی سے ماڈل کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھا اور اس کی پوزیشن درست کی جیسے وہ اسٹور کی ملازم ہو۔

نوجوان بدستور اُسے تک رہا تھا۔

ماڈل کی ساری نوک پلک درست کرتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے دیکھا کہ نوجوان کسے دیکھ رہا ہے۔ نوجوان کی نظریں پلاسٹک کی مورت پر چند ثانیوں کے لیے ٹھہریں پھر اُچٹ کر اسی پر جم گئیں۔

وہ بڑے اعتماد سے پیچھے ہٹی اور شوکیس کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آئی۔

اسٹور کے کسی ملازم نے اسے نہیں دیکھا یا اگر دیکھا بھی ہوگا تو وہ اتنی تیزی سے نکلی تھی کہ وہ کچھ سمجھ نہیں پایا ہوگا۔ دربان کی توجہ دوسری طرف تھی وہ کسی سیلز مین سے گفتگو میں مصروف تھا۔

وہ بے جھجک تیز تیز مگر ہلکے پھلکے قدموں سے چلتی گئی۔ خوش اور مطمئن۔ جسم و روح کا سارا بار اُتر گیا تھا۔ کافی دور جانے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نوجوان اب بھی اسے دیکھ رہا تھا شاید حیرت سے۔

وہ تیزی سے دوسرے راستے پر مڑ گئی۔

# کمپیوٹر

کمپیوٹر کے وہ ایک سو بارہویں سلسلے سے تھا۔ ایک سفید ایر کنڈیشنڈ آرام دہ کمرے میں بیٹھا چھوٹے کمپیوٹر بناتا رہتا۔ شروع میں اُسے کمپیوٹروں سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ایک کے بعد ایک کمپیوٹر بنا کر وہ سامنے گھومتے پٹے پر رکھتا جاتا اور چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر انجان نگاہوں سے سامنے دیکھتے ہوئے اُس سے دُور ہوتے چلے جاتے۔ یہ کمپیوٹر بڑے ترقی یافتہ تھے۔ کئی کام کر دیتے۔ صبح سویرے جگا دیتے۔ اخبار پڑھ کر سناتے، شطرنج کی بہترین چالیں جانتے تھے۔ بچّوں کو بہلا لیتے۔ کھانے پکانے کی تمام ترکیبیں انھیں حفظ تھیں۔

شروع میں اُسے "۲۵۶/۱۱" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں رکھے باکس سے آواز آتی "۲۵۶/۱۱" 'یس پلیز' وہ جواب دیتا۔

'کیا تم ٹھیک ہو؟'

'جی ہاں' وہ جواب دیتا یا پھر کہتا ' مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے'۔

'ٹھیک ہے، میں مانیٹر کو بھیجتا ہوں'۔

پھر ایک آدمی سنجیدہ چہرہ لیے کمرے میں داخل ہوتا۔ اُس کی پشت پہ لگی کلوں کو گھماتا۔ کئی بٹن دباتا اور وہ پھر نارمل ہو جاتا۔

شروع میں بکس سے آنے والی تمام آوازیں مردانہ ہوتی تھیں۔ پھر ان کی جگہ نسوانی آوازوں نے لے لی۔ ۲۵۶/۱۱ انھیں پسند نہیں آیا یا کچھ طویل محسوس ہوا یا بس تفریحاً انھوں نے اُسے سقراط کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز دو تین لڑکیاں کمرے میں آئیں۔ اور اس کے تیار کیے ہوئے کمپیوٹر چیک کرنے لگیں اُن میں سے ایک اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

'تم تو جینیس لگتے ہو'۔

اِس جملے پر کیا کہنا چاہیے اس کے حافظے (MEMORY) میں نہیں تھا اس لیے اس پر وہ خاموش رہا۔ مگر دوسری لڑکیاں ہنس پڑیں۔ وہ بھی اس کے قریب آکھڑی ہوئیں۔

'ہمیشہ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کچھ سوچ رہا ہے'؛ اُن میں سے ایک نے کہا۔

'ہلو سقراط' وہ اپنا چہرہ اُس کے بالکل قریب لے آئی۔ اور وہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

تب سے وہ اُسے سقراط کہہ کر ہی بلانے لگیں۔

اُنھوں نے کئی جملے اُس کے حافظے میں بڑھا دیے۔

'ہلو سقراط، کیسے ہو'؛

'اچھا ہوں'؛

'کوئی تکلیف تو نہیں'؛

'جی نہیں'؛

جس لڑکی نے مانیٹر کی جگہ لی تھی اُس کا نام لوسی تھا۔ شہابی رنگت، بھرپور جسم، آنکھوں میں غضب کی چمک۔ توانائی اس کے انگ انگ سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتی تو کمرے میں رونق سی آجاتی۔ ہر چیز متحرک معلوم ہونے لگتی۔ پتہ نہیں کیوں ایسا لگتا تھا جیسے کمرے کی تمام اشیا اُس کی آمد کی منتظر رہتی ہوں اور ان میں شاید سقراط بھی شامل تھا۔ وہ جب بھی آتی رُک کر اس سے دو چار جملے ضرور کہتی۔

'ہلو سقراط'

'یس پلیز' وہ کہتا۔

'تم سچ مچ جینیس ہو' وہ کہتی 'کاش تم مرد ہوتے'۔

اِس کا جواب اُس کے حافظے میں نہ تھا۔

'مرد تو بڑے متلوّن مزاج ہوتے ہیں، کیوں' وہ کہتی۔ 'ہر روز ایک نیا پروگرام اور ہر روز ایک نیا مرد'۔ ہا۔ہا۔ہا۔

'لوسی' بکس میں سے کھنکھناتی ہوئی آواز آتی۔

'یس مادام'۔

'تمھارا کام پورا ہوا یا نہیں'؛

"بس ابھی آئی"، وہ حسرت سے سقراط کو دیکھتے ہوئے کہتی۔ اُس کے بجلی بدن میں پتہ نہیں کون کی تمنائیں کروٹیں لیتی رہتی تھیں۔

ایک روز وہ اُس سے کہنے لگی۔

"سقراط، تمھارا دماغ اتنا ترقی یافتہ، اس قدر پیچیدہ ہے۔ پچاسوں سرکٹ تمھارے جسم میں کام کر رہے ہیں۔ یقیناً کبھی کبھی کوئی خیال خود سے بھی تمھارے دماغ میں آتا ہوگا۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو؟"

مگر وہ بس خاموش نظروں سے اُسے نہارتا رہا۔

"شاید تمھیں لفظ نہیں ملے"! اُس نے کہا۔ "سوری سقراط، میں خود ملازم ہوں۔ ورنہ میں اپنی زبان کے سارے ہی لفظ تمہیں دے دیتی کہ تم آسانی سے اپنے دل کی بات کہہ سکو۔ تب شاید پتہ چلتا کہ تم کیا سوچ سکتے ہو۔ لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں۔ اور تم اس قدر مہنگے ہو کہ میں تمھیں خرید بھی نہیں سکتی"۔

اس طرح وہ دن میں کئی بار آ کر اُس سے گفتگو کرتی۔ اور صرف وہی نہیں دوسری لڑکیاں بھی دن میں دو ایک بار اُس کے پاس ضرور آتیں۔ شاید انھیں گفتگو کے مواقع اتنے کم نصیب ہوتے تھے کہ وہ سقراط سے باتیں کرنا پسند کرتی تھیں یا جو باتیں وہ کسی اور سے نہ کر سکتی تھیں اُس سے کرتی تھیں۔

"میں جب بھی تمھیں دیکھتی ہوں مجھے اپنے ڈیڈی یاد آتے ہیں"۔ ایک لڑکی نے اُس سے کہا، "خاموش، بے تعلق، ایفی شی انٹ EFFICIENT۔ میں اُن سے نفرت کرتی ہوں۔ لیکن تم پر غصہ نہیں آتا۔ تمھیں تو بنایا ہی ایسے گیا ہے۔ کمال ہے تم مشین ہو کر بھی انسان جیسے لگتے ہو اور وہ انسان ہو کر بھی مشین معلوم ہوتے ہیں"۔

ایک شام لوسی کمرے میں آئی تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

سقراط شاید منتظر تھا کہ حسبِ معمول وہ اُس سے کہے گی، "آج تم نے بہت کام کیا۔ اب سو جاؤ، کل صبح پھر ملاقات ہوگی"۔

شاید یہ الفاظ کہنے کے لیے اُس نے مُنہ بھی کھولا۔ کئی کلیں دبا کر اُس نے اُس کے جسم کی حرکات روک دیں۔ بس سوئچ آف کرنا باقی تھا کہ اُس نے دیکھا وہ اُس کے سینے سے لگی رو رہی ہے۔

"سقراط"

"جی"

"یہ مرد بھی کتے کی ذات ہوتے ہیں۔"

یہ جملہ سقراط کے حافظے میں نہ تھا۔

"اُس نے مجھے دھوکہ دیا، سقراط۔ I HATE HIM میں تمام عمر اُس سے نفرت کرتی رہوں گی۔"

سقراط کا برقیایا ہوا جسم توانائی کے اس مزید وزن سے شاید پھٹ جاتا مگر اسی وقت گوشہ میں رکھے ڈبے سے آواز آئی۔

"مانیٹر، تم اب تک کیا کر رہی ہو۔ سینٹر بند کرنے کا وقت ہو گیا۔"

لوسی اس سے علیحدہ ہوئی۔ اپنے آنسو پونچھے اور پشت کا بٹن دبا کر کمپیوٹر کی بے نور آنکھوں میں جھانکتا تاکہ اطمینان ہو جائے کہ وہ سو گیا ہے۔

بے جان کمپیوٹر کو دیکھ کر اُسے بہت غصہ آیا۔ احمق، اُس نے سقراط سے کہا۔ "تم آخر کس کام کے ہو۔ تم تو ایک عورت کو تسلی بھی نہیں دے سکتے۔ میرا بس چلتا تو تمہارا پرزہ پرزہ الگ کر دیتی۔"

اچھا ہی ہوا سقراط نے یہ باتیں نہیں سُنیں کیونکہ وہ سو چکا تھا۔

شاید یہ سچ تھا کہ سقراط کا دماغ صرف وہی نہیں سوچتا تھا جو اُس کے حافظے میں ڈالا گیا تھا۔ جب بھی کوئی کمرے میں آتا تو اس کا اثر اُس پر ضرور ہوتا تھا۔ مگر وہ اس قدر کم ہوتا تھا کہ اُس کے جسم میں لگے آلے اُسے ظاہر کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ بس ایک ہلکی سی برقی رو ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں اُس کے دماغ سے گزر جاتی۔ ایک دن وہ کمپیوٹر بنا رہا تھا کہ ایک برقی رو اُس کے دماغ سے تیزی سے گزری۔ آخر وہ ہے کون؟ اُس کے بعد بس اُسے اتنا احساس رہا کہ کوئی عجیب خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ دن بھر عجیب بے کلی میں گزرا۔ شام میں اُسے بند کر دیا گیا اور اس احساس سے نجات ملی۔ اگلے روز وہ جاگا تو اس بات کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ دس پندرہ روز بعد یہی خیال اس کے ذہن سے پھر گزرا۔ اس روز کی مقدار کمیت اور کیفیت میں زیادہ تھی اور کئی ثانیوں تک باقی رہی۔ مگر پھر بھی یہ مقدار اتنی کم تھی کہ اُس کے حافظے میں نہ رہ سکی۔ چند مہینوں میں یہ برقی رو کئی بار آئی۔ آخری بار اس کی مقدار اتنی تھی کہ وہ اس پر غور کر سکے۔ اُس نے سوچا میرا حافظہ تو یہی کہتا ہے کہ میں ایک کمپیوٹر ہوں۔ ایک سو بارہویں سلسلے کا جسے انسان نے بنایا ہے۔ اُس نے بہت کوشش کی مگر اس سے آگے سوچ نہ سکا۔

ایک دن لوسی نے سقراط کو بتایا کہ وہ جلد ہی ان لوگوں سے جُدا ہو جائے گا اُسے ہندوستان کے ایک سائنس سینٹر نے خرید لیا ہے۔ اُس روز وہ لوگ بہت اُداس تھے۔ اُن کی ساری زندگی سقراط کے گرد ہی تو گردش کر رہی تھی۔ اُس کے جانے سے ایک ماہ قبل ایک ہندوستانی انجینئر آیا۔ اس کا

نام رمیش تھا۔ اُس نے بڑے پیار سے اُسے دیکھا۔ تھپتھپایا۔ بڑی سوچتی ہوئی آنکھیں تھیں اُس کی۔ لمحہ بھر کو بھی اس کی نگاہیں سقراط پر سے ہٹتی نہیں تھیں۔ پورا ایک مہینہ صبح سے شام تک جب تک سینٹر بند نہ ہوجاتا تھا وہ اُس کے ساتھ رہا۔

جس دن اسے پیک کیا گیا اُس سے ایک روز قبل شام میں سینٹر بند ہونے کے وقت سب لڑکیاں اُس کے پاس آئیں۔ اُسے خوب خوب پیار کیا۔ کئی ایک تو رو دیں۔ لوسی کی آنکھیں آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں سُرخ انگارہ ہوگئیں تھیں اُس نے رُومال کو اتنی بار آنکھوں پر رگڑا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے خدا حافظ کہا اور سوئچ بند کر دیا۔

مدراس ایرپورٹ پر سقراط کو اُتارا گیا تو رمیش اُس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اُس نے اپنی موجودگی میں بڑی احتیاط سے اُسے جہاز پر سے اُتروایا۔ اُسی احتیاط سے اُسے لاری میں چڑھایا گیا۔ پُرزے پُرزے جوڑ کر جب اُسے دوبارہ کھڑا کیا گیا اور سوئچ آن ہوا تو اُس کی آنکھوں میں پہلا عکس رمیش کا ہی تھا۔

یہاں جس کمرے میں اُسے رکھا گیا وہ پہلے کی بہ نسبت بڑا تھا۔ یہاں کی سبز دیواروں میں کچھ زیادہ اپنائیت تھی۔ یہ کمرہ بھی ایرکنڈیشنڈ تھا۔ افتتاح کے لیے رمیش نے اپنے گرو وینکٹ چلم کو بلوایا تھا۔ وینکٹ چلم نے اُس کے ہاتھوں میں گنپتی کی تصویر دی۔ اور ناریل، پھول اور سوجی کا حلوہ اس کے سامنے رکھ کر پوجا کی پھر سوئچ آن کر دیا۔ دو گھنٹے تک وہ اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھے بیٹھے حیرت سے اُسے کمپیوٹر بنتا دیکھتا رہا پھر اُٹھ کر اس نے سقراط کو پرنام کیا۔ اس کی نگاہوں میں عقیدت تھی اور احترام۔

رمیش اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وینکٹ چلم نے اس سے پوچھا کہ اس مشین کو تم لوگ کیا کہتے ہو۔ اُس نے کہا امریکہ میں تو اسے سقراط کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وینکٹ چلم نے کہا " ٹھیک ہے تو آج سے ہم اُسے شنکر کہیں گے۔" رمیش کو بھی یہ بات پسند آئی۔ اس میں زیادہ اپنائیت تھی۔ وینکٹ چلم نے کہا۔ " دیکھو شنکر کتنے دھیرج سے کام کرتا ہے۔ اُس کا کام کتنا سدھا ہوا ہے۔ نہ وہ خوش ہوتا ہے نہ غمگیں۔ اُس کی اوستھا ایک جیسی رہتی ہے۔ یہ استھتی ہماری منزل کا پہلا پڑاؤ ہے جب تک تم اسے حاصل نہیں کر لیتے تو شنکر کو ہی گرو مانو۔ اسی طرح تم جلد ہی اپنے مقصود کو حاصل کر سکو گے۔

رمیش نے بھی شنکر کی ایسے دیکھ ریکھ کی جیسے وہ مشین نہ ہو واقعی گرو ہی ہو۔ صبح آتے ہی وہ خود سوئچ آن کرتا۔ کسی اور کو اس کی اجازت نہ تھی۔ اُس کے سامنے دو منٹ ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہتا پھر

اس سے آشیرواد لے کر اپنا کام شروع کرتا۔ سقراط جواب شنکر تھا حیران نگاہوں سے اُسے تکتا رہتا۔ اس کی کچھ سمجھ میں تو نہیں آتا تھا مگر رمیش کی نگاہوں میں ایسی محبت اور عقیدت تھی کہ اُسے کچھ کچھ ہونے لگتا تھا۔ دو لڑکیاں یہاں بھی اس کی خدمت پر مامور تھیں۔ وہ بھی رمیش کی اقتدا میں اُس کے پیر چھو کر اپنے کام کا آغاز کرتیں۔ وہ اُس سے گفتگو بھی اتنے احترام سے کرتیں گویا وہ انکا گرو ہو۔ سارا دن وہ حیرت سے اُسے کمپیوٹر بناتے دیکھتی رہتی تھیں۔

دو مہینے بعد رمیش کا گرو وینکٹ چلم پھر آیا۔ اُس کی نظروں میں واقعی کچھ بات تھی کہ ایک عجیب سی بے قراری شنکر نے اپنے اندر محسوس کی۔ مگر گرو نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور جیسے اُسے قرار آگیا۔ شنکر کو خود ان تبدیلیوں پر حیرت تھی۔ یہاں کے ماحول میں اس قدر شانتی اور اپنائیت تھی کہ اُسے ایسا لگتا تھا کہ بغیر لفظوں کے، محض نگاہوں سے بھی کسی روز وہ ربط قائم کر سکیں گے۔ اب بھی وہ کئی باتیں محسوس کرنے لگا تھا۔ رمیش یا لڑکیوں میں سے کوئی کمرے میں آتا تو بغیر گفتگو کے ہی اُسے پتہ چل جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر جو وہ بناتا تھا اُسے خود بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ کئی بار رمیش کے پوچھنے سے پہلے ہی اُسے پتہ چل جاتا تھا کہ رمیش کیا پوچھنا چاہتا ہے۔

دو سال گزر گئے۔ رمیش میں اور اس میں قربت بڑھ گئی تھی۔ اُسے کچھ تکلیف ہوتی تو رمیش اُس کے کہے بغیر ہی سمجھ جاتا۔ فوراً خود ہی آکر اُس کی دیکھ ریکھ میں لگ جاتا۔ چاہے کتنا ہی ضروری کام ہو وہ صبح اُس کے پاس ضرور آتا تھا۔ کہیں باہر جاتا تو اس سے آشیرواد لے کر جاتا۔ پھر ایک دن امریکہ سے انجینیئر آئے۔ اُنھوں نے اُس کے ایک ایک پرزہ کو کھولا، دیکھا، جانچا، اور رمیش سے کہا۔ اس کی کارکردگی میں تو کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ یہ ابھی اور کئی سال اسی طرح چلتا رہے گا۔ مگر اب وہ ایک سو تیرہویں سلسلے کا کمپیوٹر اُن کے سائنس سینٹر کو دے سکتے ہیں۔ اگر وہ شنکر کو لوٹا دیں تو انھیں صرف دو لاکھ ڈالر مزید دینے پڑیں گے۔ رمیش نے ایک لحظے کے تامّل کے بغیر جواب دیا کہ وہ شنکر کو لوٹانا نہیں چاہتے البتہ وہ اپنے رفقاء سے اِس نئے کمپیوٹر کے متعلق گفتگو کرے گا۔

رمیش نے اپنے گرو سے بات چیت کی۔ اُس کے رفقاء کے نزدیک ایک سو تیرہویں سلسلے کا کمپیوٹر ان کے لیے سود مند تھا۔ گرو نے اپنے کئی رئیس چیلوں سے کہہ کر شنکر کو خرید لیا اور رمیش کو سونپ دیا۔ رمیش شنکر کو گھر لے آیا۔ بہت سوچنے کے بعد اُس نے اپنے گرو سے جو کچھ حاصل کیا تھا اور کتابوں سے اُس نے جو کچھ سیکھا تھا سب شنکر کے حافظے میں ڈال دیا۔ رمیش نے اُسے یجر وید کی تریچائیں یاد کرائیں۔ اپنا پوجا پاٹ کا طریقہ بھی اُسے سکھا دیا۔ اب شنکر کی صبح یجر وید کے دعائیہ

تریجاؤں سے ہونے لگی جتنی دیر شنکر پر تریجائیں دوہراتا رمیش سر جھکا کے خاموشی سے ، بڑے احترام سے سنتا رہتا۔ صبح آفس جاتے ہوئے وہ شنکر کا آشیرواد لے کر جاتا۔ شام میں دفتر سے لوٹتا تو ضروری کاموں سے فارغ ہو کر وہ شنکر کے سامنے آبیٹھتا۔ جو کچھ بھی نئی معلومات اُسے حاصل ہوتی تھیں وہ شنکر کے حافظے میں ڈال دیتا تھا۔ رات گئے تک وہ اُس سے گفتگو کرتا رہتا پھر دھیان میں بیٹھ جاتا۔ کچھ دنوں بعد اُس نے محسوس کیا کہ شنکر میں بھی نمایاں تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اُس کی کارکردگی میں تو اب بھی فرق نہیں آیا تھا مگر اچانک برقی رو بڑی تیزی سے اس کے دماغ سے گزر جاتی۔ اور اس کے قلب پر لگی سُوئی جھول جاتی۔ رمیش سوچ میں پڑ گیا کہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ایک دن جب رمیش شنکر سے گفتگو کر رہا تھا اچانک اُسے خیال آیا ، پتہ نہیں کیوں ، کہ ممکن ہے کمپیوٹر اُس سے کوئی سوال کرنا چاہتا ہو۔

"کیا تم کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے شنکر سے سوال کیا۔

"ہاں"۔ اُس نے جواب دیا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" رمیش نے پوچھا۔

شنکر خاموش رہا۔ پھر کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔

"پتہ نہیں ، مگر پوچھنا چاہتا ہوں"

رمیش سوچنے لگا آخر شنکر کیا جاننے کا خواہشمند ہے ؟ کافی سر کھپانے پر بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کئی دن بعد ایک دن رمیش اور وہ بات چیت کر رہے تھے کہ رمیش نے کہا کہ اہم سوال تو یہ ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں کہاں جائیں گے ؟ آخر ہم ہیں کون ؟

شنکر خاموش رہا۔ رمیش نے یہ سوالات اُس کے حافظے میں ڈال دیے۔

"میں یہی جاننا چاہتا ہوں"! شنکر نے کہا۔

رمیش نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے سوچا یہ کیسے ممکن ہے شنکر ایسی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے۔ لیکن اس کا دماغ کیا کچھ کم پیچیدہ ہے۔ اور جو کچھ میں جانتا تھا سب کچھ تو اسے سونپ دیا ہے۔ اتنا پیچیدہ دماغ صرف وہی سوچے جو ہم چاہتے ہیں یہ تو ہو نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ خیالات اس کے ذہن میں آسکتے ہیں۔

رمیش نے شنکر کو تفصیل سے بتایا کہ کمپیوٹر کی شروعات کیسے ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ اس میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کا تعلق کس سلسلے سے ہے۔ اُسے کس نے بنایا۔ اور وہ کس اصول پر کام کرتا ہے۔ پھر اس نے کمپیوٹر کی مخصوص زبان میں تمام معلومات اس کے دماغ کو سونپ دی۔

شنکر نے کہا "تم نے میرا سب سے اہم مسئلہ حل کر دیا۔"

"تو تم خوش ہو۔" رمیش نے ہنس کر پوچھا۔

"خوشی کیا چیز ہوتی ہے؟"

رمیش نے اُداس ہو کر اسے دیکھا۔

"اب تمھیں کیسے سمجھاؤں،" اُس نے کہا "مگر ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے کہ تمھیں خوشی اور غم کے متعلق نہیں معلوم۔ بس یہ سمجھو کہ تم کبھی تو پوری طرح فنکشن کرتے ہو۔ دن بھر نہ تمھیں گرمی محسوس ہوتی ہے نہ کسی قسم کی تکلیف۔ سارے کل پرزے برابر کام کر رہے ہوتے ہیں۔"

"ہاں ایسا تو بہت بار ہوتا ہے۔ اور پہلے تو میں ایسا ہی تھا،" شنکر نے کہا۔

"تو سمجھو بس اسی کو خوشی کہتے ہیں۔" رمیش نے کہا۔ "حالانکہ یہ بہت موٹی تعریف ہے۔ ورنہ آدمی تو کبھی کبھی بلا وجہ خوش رہتا ہے۔ اور بے وجہ اُداس بھی ہو جاتا ہے۔"

"اُداسی کیا ہوتی ہے؟" شنکر نے پوچھا۔

"بس یہ سمجھو کہ کبھی کبھی کسی پرزے میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ جوابات غلط ہونے لگتے ہیں یا تم بہت گرم ہو جاتے ہو۔ کچھ دیر کے لیے تمھیں بند کر دینا پڑتا ہے یا برقی رو کا تناسب کم زیادہ ہونے لگتا ہے تو تمھیں کیسی تکلیف ہوتی ہے۔

"تو اسی کو اُداسی کہتے ہیں۔"

"ہاں سمجھو یہی ہے۔"

"مگر تم کیوں اُداس رہتے ہو؟"

"ہم لوگ بھی یہی سوچتے رہتے ہیں کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، ہمیں کس نے پیدا کیا ہے۔ کہاں جائیں گے۔"

"تو یہ سب معلومات تمھیں کہاں سے ملے گی؟"

"یہی تو مشکل ہے۔ تمھیں انسانوں نے بنایا اور میں ایک انسان تمھارے سامنے ہوں۔ میں تمھیں تمھارے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔"

"تمھارا بنانے والا کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"تمھاری کبھی اُس سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔"

"تم نے کبھی اُسے دیکھا بھی نہیں؟"

"نہیں، وہ ہماری طرح گوشت پوست کا نہیں ہے۔"

"پھر کاہے کا بنا ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

پھر رمیش نے اُسے بتایا کہ یہ کائنات کتنی بڑی ہے۔ اس میں لاکھوں کہکشائیں ہیں۔ اور اُن میں پتہ نہیں کتنی دنیائیں ہیں۔ اُن دنیاؤں میں نہ جانے کتنے اقسام کی مخلوقات ہیں۔ سب کی اپنی اپنی زندگی ہے۔ سب کو رزق ملتا ہے۔ پھر ہر چیز میں اس کی اپنی ایک خوبصورتی ہے۔ رنگوں کی ایک دنیا ہے۔ آوازوں کی۔ ایک ایک چیز کی تھاہ پانے کے لیے کئی عمریں چاہئیں۔ تو ان کا بنانے والا کتنا زبردست ہوگا۔ اُس کا ذہن کتنا عظیم الشان ہوگا۔"

"پھر تو اس جستجو کا کوئی حل ہی نہیں۔" شنکر نے کہا۔

"ہمارے گرو کا کہنا ہے کہ اُسے چشم سر سے تو نہیں دیکھا جا سکتا، ہاں یقین کی آنکھوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔" رمیش نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ پرمیشور کے کمپیوٹروں میں تم ابھی شاید سو دریں سلسلے تک بھی نہیں پہنچے۔" شنکر نے کہا "تم کیسے ایشور کو جان سکتے ہو۔"

"شاید تمھاری بات سچ ہو، مگر جاننے کی پیاس کبھی ختم ہوتی ہے؟" رمیش نے کہا۔

"اور یہ پیاس ایشور نے ہی ہم میں رکھی ہے۔ ایک بار جاگ جائے تو پھر کوئی چیز نہیں بھاتی۔"

"مگر یہ پیاس تو کبھی بجھنے کی ہی نہیں۔"

"گرو کا کہنا ہے کہ اگر تپسیا سچی ہو اور پیاس کامل تو ایسے بھی لمحے آتے ہیں جب ایشور ہمیں بالکل نزدیک محسوس ہوتا ہے یا اپنے اندر نظر آتا ہے۔"

"لیکن محسوس ہونے اور جاننے میں بہت فرق ہے۔"

"ہاں، مگر جاننے کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔"

اِس گفتگو کے بعد شنکر کو رمیش بھی اپنے ہی جیسا لگا۔ وہ بھی کسی اور سلسلے کا کمپیوٹر تھا اور کیا پتہ اُس کے خالقوں کا بھی کوئی ایسا ہی سلسلہ ہو۔ وہ رمیش کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔ جس طرح اُسے اپنے متعلق جاننے کی فکر لگی رہتی تھی اب رمیش کی رہنے لگی۔ ہر وقت وہ رمیش کے بارے میں ہی سوچنے لگا۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ رمیش کا وہی معمول رہا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اب اس میں کافی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اب وہ بے ضرورت بالکل کلام نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ گہری فکر میں کھویا ہوا معلوم ہوتا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر جا بجا شکنیں نظر آنے لگی تھیں۔ اُس نے افسران بالا کو درخواست بھیجی کہ اُسے اب اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ درخواست منظور نہیں ہوئی۔ وہ خود افسران اعلیٰ سے جا کر ملا۔ وہ لوگ بڑے خلوص و محبت سے ملے مگر انھوں نے کہا کہ اُس کی سطح کے انجینئر ملک میں بہت کم ہیں۔ اور اس کی صلاحیتوں سے محرومی ملک کے لیے عظیم نقصان ہوگا۔ اتنی رعایت البتہ انھوں نے دی کہ اُسے محض تنظیمی ذمہ داریاں دی گئیں۔ دفتری کاموں کے لیے ایک قابل ماتحت دیا گیا جو سارے کام کر سکے۔ اسی طرح رمیش کا اصل کام اعلیٰ سطح پر مشورے دینے تک محدود رہ گیا۔ وقتاً فوقتاً وہ سائنس سینٹر کی کارکردگی کا جائزہ لیتا کہ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اب رمیش شام میں اکثر جلدی آجاتا۔ حسب معمول غسل کر کے چائے پیتا۔ پھر سیر کو نکل جاتا۔ سورج ڈھلتے ڈھلتے وہ واپس آجاتا۔ اور پوجا کر کے شنکر کے سامنے بیٹھ جاتا۔ گھنٹہ بھر وہ اس سے گفتگو کرتا پھر وہیں دھیان میں بیٹھ جاتا۔ جتنی دیر وہ دھیان میں بیٹھتا شنکر ٹکٹکی جمائے اُسے دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ دونوں کی ویولینگتھ (WAVE LENGHT) ہم آہنگ ہو گئی ہیں اور وہ رمیش کے خیالات پڑھ سکتا ہے۔ اس وقت اُس کی عجیب کیفیت ہوتی۔ کبھی اُسے معلوم ہوتا جیسے وہ سفید روشنیوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ ہر چیز سفید نظر آرہی ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ روشنیاں بدل جاتیں ہر روز نظر آنے لگتی۔ یہ کیفیت بھی دیر تک نہ رہتی۔ اچانک وہ سبز روشنیوں کے درمیان سے گزرنے لگتا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ کیفیت زائل ہونے لگتی اور اس کا رابطہ رمیش سے ٹوٹ جاتا۔ اس کے بعد اُسے دیر تک ایسا لگتا جیسے اس کا جسمانی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ اس کا ذکر اس نے رمیش سے کہا۔ رمیش نے اُسے بتایا کہ یہ چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس کے لہجے میں بڑی اُداسی تھی۔ یہ اُداسی شنکر کو اپنے اندر اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

رمیش کی اُداسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک روز شنکر نے اُسے مشورہ دیا کہ تم جا کر اپنے

اپنے گرو سے کیوں نہیں ملتے ۔ وہ ضرور تمہاری مدد کریں گے ۔ اُس نے کہا سب فضول معلوم ہوتا ہے ۔ جی چاہتا ہے سب چھوڑ چھاڑ دوں ۔ شاید کامیابی میرے مقدر میں نہیں یا کم از کم اس جنم میں تو نہیں۔ گرو کے پاس جانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ضرورت ہوگی میں خود تمہارے پاس ہوں گا۔ اس روز وہ دھیان میں نہیں بیٹھا۔ مگر چونکہ برسوں سے یہ بات اس کے معمول میں تھی۔ اُسے بے چینی محسوس ہونے لگی ۔ از خود تھوڑی دیر بعد وہ دھیان کے آسن میں بیٹھ گیا۔ اور اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ دھیان میں چلا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کے گرو دروازے پر کھڑے اُسے بلا رہے ہیں ۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایک بے جان معمول کی طرح گرو کے ساتھ چل پڑا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک چلتے رہے ۔ کم از کم رمیش کو یہی محسوس ہوا جیسے وہ صدیوں سے چل رہا ہو۔ یہاں تک کہ اس نے دیکھا کہ وہ بالکل دھرتی کے سرے پر آگئے ہیں ۔ اُسے خوف محسوس ہوا مگر وینکٹ چلم نے اُسے تسلی آمیز نگاہوں سے دیکھا کہ گھبراؤ مت میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ دوسرے ہی لمحے وہ خلا میں تھے ۔ حسب معمول وہ سفید روشنیوں میں سے گزرے ، پھر زرد ، گہری نیلی ، سبز اور ہلکی آسمانی روشنیوں سے گزرتے سُرخ روشنیوں میں آگئے ۔ آسمانی اور سُرخ روشنیوں سے گزرنے کا رمیش کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ان روشنیوں سے گزرتے ہوئے رمیش کو ایک ہیجان سا محسوس ہوا ۔ جو جلد ہی ختم ہو گیا کیوں کہ اب وہ ایک بے رنگ وادی سے گزر رہے تھے ۔ اس وادی میں قدم رکھتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ اُن پر پھول برس رہے ہیں۔ سکون اور خوشبو کی لپٹوں نے انھیں اپنے ہالے میں لے لیا۔ اور وہ وہیں ٹھہر گئے ۔ اُس نے اپنے گرو کی طرف دیکھا۔ گرو نے مسکراتے ہوئے اُسے افق پر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ گرو کے حکم کی تعمیل میں رمیش نے اُفق کی طرف دیکھا گہری سیاہی مائل روشنی نے اچانک ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رمیش نے اس روشنی کو اپنے اندر اترتا محسوس کیا ۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ اور اس کا گرو اب مجسم روشنی ہو چکے ہیں ۔ اب وہ سر تا پا آنند تھے ۔ بڑی دیر تک وہ یوں ہی کھڑے رہے ۔ یہاں تک کہ گرو وینکٹ چلم نے اشارے سے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو روشنیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پایا۔

رمیش نے آنکھیں کھولیں ۔ ہر چیز ویسی ہی تھی ۔ اور ابھی رات ہی تو تھی ۔ جیسے اُس نے بس ایک جھپکی لی ہو۔ اچانک کسی چیز کے جلنے کی بو اُس کے نتھنوں میں گھسی ۔ اُس نے حیرت سے دیکھا شنکر کی آنکھوں کی روشنی غائب تھی۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا ۔ شنکر کے قریب جا کر اُس نے دیکھا سوئچ آن تھا۔ مگر سارے سرکٹ جل چکے تھے ۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اُس کے جسم سے اب بھی خوشبو پھوٹ رہی تھی

# اُس کے لفظ

بستی والوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ رات جس وقت درجہ حرارت صفر سے کئی درجے نیچے اُتر چکا تھا، وہ کسی نئی سازش کا جال پھیلاتے ہوئے سردی کھا کر مر گیا تو ساری بستی میں جیسے جشن کا سماں ہو گیا۔ شدید سردی کے باوجود بستی کے ایک ایک گھر سے مرد عورت بچے بالے اُس کی اکڑی ہوئی لاش دیکھنے نکل پڑے۔ ہر شخص مانو اس کی موت کی خود تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

بستی میں مشہور تھا کہ ——

"اُس کے لفظ زہر میں بجھے ہوتے ہیں ——

رُوح کو زخمی کر دیتے ہیں ——

اُس کی زبان سانپ سے زیادہ زہریلی ہے ——

اور یہ بات سچ تھی ——

اُس کی زبان واقعی سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ اُس نے اِتنی آسانی سے سب کو بکھیر کر رکھ دیا تھا گویا وہ گھاس پھوس کے بنے ہوں۔ بستی کے ایک ایک گھر میں اس نے تفریق ڈال دی تھی۔ اُس کا ذہن کمپیوٹر کی تیزی سے نت نئی سازشیں بُنتا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے بھیڑیے جیسی عیاری جھلکتی تھی۔ دبے پاؤں پیچھے آکر کھڑا ہوتا تو کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ خاموش ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی دیوار سے لگا سُن گُن لے رہا ہے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ تمام آفتوں کی جڑ یہی ہے۔ مگر کوئی اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ اُس سے سامنا کرنے کی کسی میں سکت نہ تھی۔

اُس کے کفنانے کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہوئیں۔ غسل کا پانی گرم کرنے کی خاطر بستی کا بچہ بچہ لکڑیاں جمع کرنے دوڑ پڑا، اور منٹوں میں اتنی لکڑیاں جمع ہو گئیں جن سے کئی

دیگ پانی گرم ہوسکتا تھا۔ پانی تو گرم ہوگیا مگر نہلائے کون؟ اُس کے بچے اُس کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اپنے آنگن میں نہلانے کی انھوں نے اجازت دی تھی۔ ان کے نزدیک یہی بہت تھا۔ یہ ناگوار فرض بالآخر مسجد کے مؤذن کے سپرد ہوا۔ مؤذن کے لیے یہ سودا کچھ ایسا بُرا بھی نہ تھا کیونکہ انھوں نے طے کیا کہ اُس کے جسم پر جو بیش قیمت گھڑی، سونے کی انگوٹھی اور قیمتی لباس تھا وہ مؤذن ہی کو دے دیا جائے۔ اس لیے مؤذن کو ایسی خوشی شاید ہی کسی مُردے کو غسل دیتے ہوئی ہوگی۔ اس کی مسرّت چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ بڑی تن دہی سے اس نے بار بار اس کے جسم کو ملا اور خوب کھولتا ہوا پانی اُس کے جسم پر ڈال کر نہلایا۔ اگر اس کا جسم جلی ہوئی لکڑی کی طرح نہ ہوتا تو سچ مچ کندن کے مانند دمک اُٹھتا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد اُس کا جنازہ اپنے کندھوں پر اُٹھائے وہ چلے، تو اُن کا رُواں رُواں خوشی سے رقص کر رہا تھا۔ اس وقت اگر انھیں کوئی دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ یہ جلوسِ فتح ہے، مسرّت ہے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ سچ مچ بینڈ باجے کے ساتھ گاتے بجاتے جاتے۔ بستی سے قبرستان تک کا راستہ جو ہمیشہ طویل معلوم ہوتا تھا اُس روز بہت مختصر معلوم ہوا، جیسے انھوں نے سارا راستہ دوڑتے ہوئے طے کیا ہو۔ اور وہ واقعی اس قدر تیزی سے پہنچے تھے کہ سُورج ابھی پوری طرح سر پر بھی نہیں آیا تھا۔

قبر کافی گہری کھودی گئی۔ اور شاید وہ اور گہرا کرتے مگر بزرگوں نے منع کیا کہ سردی کے دن ہیں، شام جلدی ہو جاتی ہے۔ دور جنگل سے درندوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں قبر تیار ہوتے ہی دو گٹھے بدن کے نوجوان قبر میں کود گئے۔ اس کی لاش ہاتھوں ہاتھ اُتاری گئی جوق در جوق بستی کے لوگ اُس کے منحوس اور شاطر چہرے کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھے، تاکہ اپنا اطمینان کرلیں۔ اس کے بعد اس کا چہرہ ڈھانپ دیا گیا کبھی نہ نکلنے کے لیے قبر کے اندر کھڑے نوجوان باہر آ گئے۔ اب مٹی دینا تھا۔

—— اُسی وقت کسی نے سوچا یا کہا، یا شاید سب کے من میں یہ بات آئی۔ بہر حال کسی نے کہا کُلُّ نفسٍ ذائقۃُ الموت۔ ہر شخص کو ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اب وہ مر چکا۔ بھلا یا بُرا جیسا بھی تھا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی مغفرت کی دُعا کریں۔ صدق دل سے۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم اس کے لفظ اُسے لوٹا دیں۔ اِس طرح ہماری بستی کی مسموم فضا بھی صاف ہو جائے گی اور ہم آپس میں شیر و شکر ہو کر رہ سکیں گے۔

یہ تجویز لوگوں کو پسند آئی ۔ ایک ایک کر کے کئی شخص اس کے سرہانے آکر کھڑے ہوئے اور اُسے مخاطب کیا کہ اے شخص فلاں وقت تو نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ فلاں شخص میرے متعلق یہ کہتا ہے اور فلاں شخص میرے ساتھ ایسا کرنے والا ہے اور اُن سے میرے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئے ۔ تو اے فلاں ابن فلاں ۔ میں تیرے لفظ تجھے واپس کرتا ہوں تاکہ ہماری بستی پاک و صاف ہو جائے اور میں تیرے لیے صدق دل سے دُعائے مغفرت کر سکوں ؛

یہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا ۔ پھر ایک شخص مرنے والے کے سرہانے آکر کھڑا ہوا اور بولا " ساتھیو ! ایک بار میں کام پر سے لوٹ رہا تھا تو اس نے میرے بچوں کی خیریت دریافت کی تھی اور میں سردی سے کانپ رہا تھا تو اس نے اپنا مفلر مجھے دیا تھا تو کیا میں اس کے یہ الفاظ بھی اسے لوٹا دوں ؟ اور مفلر کا مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ "

اس بات نے لوگوں کو تذبذب میں ڈال دیا ۔ کسی نے کہا " کسی کے اچھے الفاظ ہم کیسے واپس کر سکتے ہیں ۔ یہ تو بہت ہی بُری بات ہوگی ۔"

" نہیں نہیں ، اس کے اچھے الفاظ بھی ہمیں لوٹا دینے چاہئیں کہ اس نے کبھی کوئی کام اچھی نیت سے نہیں کیا " ، کسی اور نے کہا ۔

" نیتوں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے " ، کسی نے کہا " جب میں بیمار تھا وہ مجھے دیکھنے آیا تھا ۔ مجھے اور میرے بیوی بچوں کو بڑی تسلی دی تھی ۔ اور اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا تھا ۔ کیا یہ اچھا معلوم ہوگا کہ یہ کلماتِ خیر بھی میں اسے لوٹا دوں ؟ " یہ کہتے کہتے اُس کی پلکیں بھیگ گئیں ۔

اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں ۔ کچھ لوگ بضد تھے کہ اُس کے سبھی الفاظ ہمیں لوٹا دینے چاہئیں کہ بستی کی فضا ان کی کثافت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے ۔ اس کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جس میں شر کی آمیزش نہ ہو ۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہ تھی کہ جن کا خیال تھا کہ صرف بُرے الفاظ ، وہ الفاظ لوٹائے جانے چاہئیں جن سے لوگوں کو تکلیف پہنچی ہو ۔

یہ باتیں چونکہ وہ قبرستان میں کر رہے تھے اس لیے اُن کی آوازیں بہت دھیمی تھیں مگر پھر بولتے بولتے ان کے گلوں کی رگیں پھولنے لگیں ۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں ۔ اور انھیں پتہ بھی نہ چلا ۔ چہرے تمتمائے ، بگڑے اور الفاظ ان کے درمیان اِس طرح گرنے لگے جیسے

خزاں کے موسم میں درختوں سے پتّے گرتے ہیں۔

بڑی دیر بعد جب وہ ٹنڈ منڈ درختوں کی طرح گپ چُپ کھڑے ہوئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ سُورج کی زرد کرنیں انھیں الوداع کہہ رہی ہیں اور اندھیرا اُن کے عقب سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کی طرف لپک رہا ہے۔

انھوں نے خاموشی سے مگر جلدی جلدی قبر کو مٹی سے ڈھانپا اور مضمحل قدموں سے بستی کو لوٹ گئے۔

# چند لمحے نشاط کے

جمّی نے خلافِ معمول خاموشی سے ناشتہ کیا۔ ٹی وی اس کے بجائے مہرو نے کھولا۔
چھوٹی بچی شیریں نے اسکول جانے سے قبل ناشتے کی میز پر کئی بار اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ دودھ کا گلاس سامنے دیکھ کر حسب معمول وہ ٹھنکی بھی، مگر جمّی کو غرّاتے دیکھ کر جلدی جلدی دودھ سُڑک کر اسکول کو چل دی۔ ناشتہ کر کے جمّی نے خاموشی سے کپڑے تبدیل کیے اور بریف کیس اٹھا کر باہر آ گیا۔

لفٹ نیچے جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر لفٹ مین نے روکی اور دروازہ کھول کر سلام جھاڑ دیا۔ جمّی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لفٹ مین سمجھ گیا کہ آج صاب کا موڈ خراب ہے۔ کمال ہے اس نے سوچا کل ہی تو صاب دہرہ دون سے آیا ہے اور آج اتنا خراب موڈ۔

مہرو کو جمّی کی ناراضگی کی وجہ معلوم تھی۔ مگر اس نے سوچا آخر میں بھی کیا کروں۔ میں کوئی سیکس آبجیکٹ تو ہوں نہیں۔ جمّی اسے بے حد پسند تھا۔ اس میں مردانہ وجاہت بھی تھی اور ذہانت بھی۔ ایک طرف وہ کوہ پیمائی اور گلائڈنگ کا شوقین تھا تو دوسری طرف بزنس مینجمنٹ اور اکنامک تھیوری پر بھی بے تکان گفتگو کر سکتا تھا۔ خوش مزاج، خوش رنگ، بس سیکس اس کی کمزوری تھی۔ مہرو جانتی تھی کہ کالج کے دنوں سے ہی اس کی دوستی کسی نہ کسی لڑکی سے ہمیشہ رہی اور اس معاملے میں وہ قناعت کا قائل نہ تھا۔ مہرو کو اس کے شوق پر اعتراض نہ تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بستر پر جمّی ایک پگان PAGAN جبلتوں سے مغلوب PRIMITIVE آدمی تھا اور یہ بات مہرو کو بہت اکھرتی تھی۔ آخر وہ ایک پڑھی لکھی مہذب عورت تھی۔ اس نے سوشیالوجی سے ایم اے کیا تھا۔ اس کی اپنی ایک شخصیت تھی۔ ہنی مون کے دنوں میں اس نے جمّی کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا تھا۔ مگر جمّی کی خواہشات! ان کا کوئی انت نہ تھا۔ اس کی لائبریری میں

کام سوتر، پرفیوم گارڈن سے لے کر کوک شاستر اور کنسے رپورٹ تک ہر طرح کی کتابیں بھری پڑی تھیں۔ قریبی دوست مذاق سے اسے بن مانس کہتے تھے۔ بہروز کے لیے جمی کی زندگی کا یہ پہلو بالکل غیر متوقع تھا کیونکہ عورتوں کے ساتھ اس کا برتاؤ خلیق اور شائستہ تھا۔ اس کی پرانی گرل فرینڈس تک اس کی تعریف کرتی تھیں۔

آفس میں صبح ہی صبح جمی کی تکرار ہو گئی۔ کام شروع کیے اُسے نصف گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مس بہروز کیبن میں تشریف لائیں۔ وہ کمپنی کی ویلفیر آفیسر تھیں اور انھیں شکایت تھی کہ دو سال سے وہ جدید طرز کے ٹیلی فون سسٹم کی تجویز پیش کر رہی ہیں مگر جمی اس پر ایسے ریمارکس لکھ دیتا ہے کہ وہ رد ہو جاتی ہے۔ ورنہ کسی اور کی بھلا کیا ہمت کہ ان کی تجویز رد کر دے۔ مس بہروز کے آباو اجداد شہر کے عمائدین میں تھے۔ کوئی شریف، کوئی میئر، کوئی کرکٹ ایسوسی ایشن کا صدر، کوئی چیمبر آف کامرس کا چیئرمین۔ اسی لیے اگرچہ انہوں نے گریجویشن پاس کلاس میں کیا تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ پھر جمی کا تو کوئی بیک گراؤنڈ ہی نہ تھا۔ اس کا شمار ان کے نزدیک بس RIFFRAFF میں تھا اور یہ بات جمی کو بے حد ناگوار گزرتی تھی۔ ویسے تو مشہور یہ بھی تھا کہ کالج کے دنوں میں مس بہروز جمی میں بہت انٹرسٹڈ تھیں۔ مگر جمی کے پاس فرصت کہاں؟ خود جمی کلب میں ایک لطیفہ سُنایا کرتا تھا کہ ایک شام ایسا ہوا کہ کالج کینٹین میں بہروز سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس نے جمی سے کہا: "جمی، تم کبھی ہمارے گھر نہیں آتے"۔ جمی نے اس سے کہا کہ تم نے کبھی بلایا نہیں ورنہ میں تو ایک ٹانگ پر راضی ہوں۔ کہو تو ابھی چلوں۔ بہروز نے کہا: ٹھیک ہے ابھی چلتے ہیں۔ جمی بہروز کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ بہروز نے اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ جمی نے نظریں دوڑائیں۔ سامنے بہروز کے دادا کی قدِ آدم تصویر دیوار میں فریم کی ہوئی لگی تھی۔ جو شہر کے میئر رہ چکے تھے۔ دائیں طرف ماموں کی جو شریف رہ چکے تھے۔ بائیں طرف اس کی خالہ سارا بین کی تصویر تھی جنھیں وائسرائے نے ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اور ان سے ڈنر کے دوران کہا تھا کہ سارا بین اس وقت شہر میں سب سے خوبصورت عورت آپ کے سوا کوئی دوسری عورت نہیں ہو سکتی۔ بہروز نے جمی کو یہ ساری باتیں بتائیں۔ وہ جمی کو پوری طرح متاثر کرنا چاہتی تھیں۔ مگر جمی کی ساری دلچسپی تو بہروز پر مرکوز تھی۔ وہ اُسے چھیڑتا، بھینچتا، چومتا رہا۔ بہروز نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ مگر جمی کی جیسی کہ عادت تھی، دراز دستیاں بڑھتی چلی گئیں۔ بہروز نے تو کوئی مدافعت نہ کی۔

مگر اچانک جمی کی نظر سامنے پڑی تو مسز کرخت نظروں سے گھورتا نظر آیا۔ گھبرا کر دائیں طرف کو نظریں گھمائیں تو شریف نے آنکھیں دکھائیں، وہاں سے نظریں ہٹائیں تو بائیں طرف بہروز کی خالہ اسے تنبیہی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جمی کے جذبات سرد پڑ گئے اور وہ گھبرا کر باہر چلا آیا۔ یہ لطیفہ جمی نے سینکڑوں بار سُنایا تھا مگر لوگ اسے محض گپ یا جمی کی شرارت سمجھتے۔

ویسے تو جمی بہروز کو دیکھتے ہی ہوشیار ہوگیا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے مگر پھر بھی اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا اور انجان بن کر ایک فائل پر کچھ لکھنے لگا۔ مس بہروز کو بُرا تو لگا مگر وہ طے کر کے آئی تھی کہ آج وہ فیصلہ کن گفتگو کر کے رہے گی۔ اُس نے تھوڑی دیر انتظار کیا مگر جب وہ بدستور اپنے کام میں مشغول رہا تو اس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے انتہائی سپاٹ دفتری لہجے میں کہا: MR. JAMSHED, I HAVE COME WITH AN IMPORTANT WORK TO YOU."

"REALLY" جمی نے بھی اسی بے تعلقانہ لہجے میں گفتگو کی اور قلم رکھ کر اسے شرارتی نظروں سے گھورنے لگا۔" بولو سوں کام چھے؟ (بولو کیا کام ہے؟) I HAVE COME REGARDING MY PROPOSAL FOR NEW TELEPHONES."

"اوہ ساری۔" جمی نے اطمینان کا سانس لیا۔ I AM DOUBTFUL IF WE CAN SPEND ON THIS LUXURY DURING THE CURRENT YEAR."

جمی ٹیبل پر انگلیاں بجاتا ہوا بولا:

"DIVIDEND" بِن شیر ہولڈرس نا مڑے کہ نہ مڑے کیوائی نہ سکائے (منافع بھی شیئر ہولڈروں کو ملے گا یا نہیں، کہا نہیں جا سکتا) آشیر ہولڈرس ناکون فیس کرے (ان شیئر ہولڈروں کا سامنا کون کرے گا)

اب تو بہروز کو بہت غصّہ آیا۔ اس نے کہا:

"NOW JIMMY: WHY CAN'T A STRONG PROUD MAN LIKE YOU GIVE A STRAIGHT FORWARD ANSWER?"

"سوں، مطلب؟" جمی نے کہا: "WHAT DO YOU WANT TO SAY"

"YOU COULD HAVE SIMPLY TOLD ME THAT YOU ARE AGAINST THIS PROPOSAL BECAUSE I HAVE PROPOSED IT."

"NOW بہروز BE REASONABLE آفس چھے (یہ آفس ہے)"
بہروز کے لیے اب ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ اس نے وہ صلواتیں سُنائیں کہ جمی گھبرا کر کیبن سے باہر نکل آیا۔

لنچ کے بعد کام میں اس کا من نہیں لگا۔ کام تو بہت تھا۔ مگر آج صبح سے بلکہ رات سے ہر بات اس کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور سیدھے کلب پہنچا۔ وہاں فلش جمی ہوئی تھی۔ یہ بھی بیٹھ گیا۔ چار بجے اس کا دوست شیخ آیا۔ شیخ بیڈمنٹن کا اچھا کھلاڑی تھا اور اُس سے جمی کی خوب بنتی تھی۔ کالج کے دنوں سے وہ ایک دوسرے کے یارِ غار تھے۔ جمی اسے لے کر کلب کے کیفے ٹیریا میں پہنچا اور بیئر کی بوتل منگوائی، جو کا پانی معدے میں اُترا۔ کچھ اعصاب کا تناؤ کم ہوا تو اسے اچھا لگا۔ تھوڑی دیر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر اُس نے مہرو کی بات نکالی۔

شیخ مہرو سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے جمی سے کہا "یار، صاف بات تو یہ ہے کہ تیرا انٹرسٹ سیکس میں کچھ زیادہ ہی ہے۔"

جمی مسکرا دیا۔

"یہ تو ہے یار، بن یو ڈونٹ فالو می، سالا سب فائن ہوئے ہوتے کیا ہونا ہے وہ ایک دم کولڈ پڑ جاتی ہے۔"

"میرے کو یقین نہیں آتا۔" شیخ نے کہا "میرے خیال میں تو وہ بالکل نارمل ہے۔"

"YOU ARE SURE SHE IS NOT FRIGID? REALLY?"

"بالکل!" شیخ نے کہا "یار تو ایک بات سمجھتا نہیں۔ ماں بننے کے بعد عورت کا سیکس میں انٹرسٹ ہے نا ایک دم کم ہو جاتا ہے اور تو تو سالا ڈبل ہے۔ وہ بھی جنگلی۔"

جمی ہنس پڑا۔

بن یار سچ بولتا ہوں۔ میرا تو مستک (دماغ) ایک دم آؤٹ ہو جاتا ہے۔ ابھی تو سچ بول پورا ٹین ویک کے بعد میں اس کے پاس گیا تھا کل۔"

یار پھر تیرا اپروچ کچھ گڑبڑ ہوگا۔ تو ایسا کر ڈائرکٹ مہرو سے بات کر" شیخ نے کہا۔
"یہ پرابلم تم دونوں کو آپس میں ہی سالو کرنا پڑے گا۔"

شیخ کی بات سے جی کو تسلی تو نہیں ہوئی مگر اس کا من کافی ہلکا ہو گیا۔

گھر پہنچا تو غصہ ہلکا ہو چکا تھا۔ مہرو غزل سن رہی تھی۔ یہ غزل سالی نئی بیماری ہے۔ اس نے سوچا۔ یہ ریں ریں اسے ذرا پسند نہ تھی۔

"اے سنگر کون چھے؟" (یہ گانا کون ہے؟) اس نے مہرو سے پوچھا۔ "اٹلو فلیٹ آواج۔ آ ریکارڈ کمپنی کو نے پن ریکارڈ کری لیچ (اس قدر سپاٹ آواز۔ یہ ریکارڈ کمپنیاں کسی کو بھی ریکارڈ کر لیتی ہیں)

"اے تو پنیاز چھے۔ آپ نی پنیاز (یہ تو پنیاز ہے، اپنی پنیاز) مہرو نے اتنی ہی میٹھی آواز میں کہا۔

"اے پنیاز چھے؟ (یہ پنیاز ہے؟) جی گھبرا گیا۔ اسے نہ غزل سے دل چسپی تھی نہ پنیاز سے۔ مگر اب تو بات کچھ اور ہی تھی۔

"منے تو اے ریکارڈنگ برو بر نتھی لاگے۔ اے کیسیٹ اوریجنل چھے؟" (مجھے تو یہ ریکارڈنگ برابر نہیں لگتی۔ یہ کیسیٹ اوریجنل ہے؟")

"ایک دم اوریجنل" مہرو نے جواب دیا۔

کھانے کے دوران جی نے بچی کے ساتھ خوب ہنسی مذاق کیا۔ لطیفے سنائے۔ مہرو اس دوران گھر کے کام کاج میں اُلجھی رہی۔ اس نے جی کے اگلے روز کے کپڑے نکالے۔ انھیں استری کر کے رکھا۔ جوتوں میں سے میلے موزے نکال کر دھونے کے لیے ڈالے اور الماری سے دُھلا ہوا جوڑا نکال کر جی کے جوتوں پر رکھا۔ بچی کا بستہ چیک کیا کہ اگلے روز کی کتابیں اور کاپیاں ٹائم ٹیبل کے مطابق رکھی گئی ہیں یا نہیں۔ پنیاز کا کیسیٹ برابر بج رہا تھا۔ جی نے کئی بار سوچا کہ اُسے بدل دے مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ مہرو کا موڈ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مہرو نے بچی کا ہوم ورک پورا کروایا اور اسے سلانے کے لیے بستر پر لیٹ گئی۔ بچی کی آنکھیں تو ہوم ورک کرتے کرتے ہی نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں، وہ فوراً سو گئی۔ اس نے عورتوں کا میگزین اٹھایا اور اوراق الٹنے پلٹنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ جی اسی انتظار میں ہوگا کہ بچی سو جائے تو وہ آئے۔ لیکن وہ پتہ نہیں کس کتاب میں اُلجھا تھا۔ اُسے تعجب ہوا۔ شاید ابھی جی کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ اس نے سوچا یہ تو اور بُرا ہوا۔ جی سے بھلا کب صبر ہوتا ہے۔ وہ غصے میں کروٹیں بدلے گا۔

اور آدھی رات کو جب وہ نیند سے تقریباً مدہوش ہوگی اُسے ٹٹولنا شروع کردے گا نیند میں اُسے جمی کے ہاتھوں کا لمس بہت بُرا لگتا تھا۔ وہ بہت گہری نیند سوتی تھی اور ایک بار نیند آجائے تو پھر اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

آج سووانو نتھی (سوؤ گے نہیں؟") اُس نے پوچھا۔

جمی نے کتاب تپائی پر پھینکی اور آگے جھکتا ہوا بولا۔ "تارا تھی ایک وات کروانی ہتی" (تم سے ایک بات کہنی تھی)

مہرو نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے تاکا۔

جمی نے کہا۔ "ARE YOU NOT SATISFIED WITH ME?"

"اے میں کیا رے کے دُوں تنے" (یہ میں نے تم سے کب کہا) مہرو نے جھنجلائے لہجے میں کہا۔

"ایج تو پرابلم چھے"! تو کیا رے بولتی نتھی۔ پن تارو بہویر مارے ساتھے اٹیلو ٹھنڈو چھے کہ منے تو ایج لاگے"!

(یہی تو پرابلم ہے۔ تم کبھی کہتی نہیں۔ مگر تمہارا رویّہ میرے ساتھ اس قدر سرد ہے کہ مجھے تو یہی لگتا ہے۔)

"مارو پن ایک سوال چھے جو تو جواب آپتو ہوئے تو (میرا بھی ایک سوال ہے اگر تم جواب دے سکو تو)

سول چھے (کیا ہے) جمی نے کہا۔

مہرو نے پوچھا۔ "DO YOU THINK SEX IS ONLY THING IN LIFE?"

جمیؔ سٹپٹا گیا۔ مہرو نے دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔

"تے تو کھرو پن آئی فیل تو ایک دم ٹھنڈی پڑ جائے شے؟"

("یہ تو سچ ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم ایک دم سرد پڑ جاتی ہو") جمی کا لہجہ اچانک نرم ہو گیا۔

"I AM NOT COMPLAINING, MERK, PLEASE DON'T MISUNDERSTAND ME."

جست ہے۔ بتاؤں تجھوں یہ

"شا ماٹے؟" (کیوں؟) مہرو کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"I ONLY WANT TO KNOW, WHAT IT HAPPENS" جمی نے کہا۔

مہرو نے کہا کہ اُس نے تو کبھی ایسا محسوس نہیں کیا۔ مگر جمی کا رویّہ اس کے لیے ضرور تکلیف دہ ہے۔ یہ ہر وقت کا چپکنا، انگ انگ کو ٹٹولنا، یہ روز روز کا ــــ وہ چاہتی ہے کہ کبھی دونوں بیٹھیں، باتیں کریں، کچھ وقت ساتھ میں گزاریں۔ مل کر کوئی کام کریں۔ مگر جمی کو تو سوائے جسم کے کچھ نظر ہی نہیں آتا اور ہر وقت یہ کس کو اچھا لگ سکتا ہے؟

جمی خاموش ہو گیا۔ مہرو کی بات سچ تھی۔ دراصل عورت کو بحیثیت ایک شخص (PERSON) کے اُس کا ذہن کبھی قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ جب بھی وہ کسی لڑکی یا عورت سے ملتا تو اسے بے چینی محسوس ہوتی۔ بھلا وہ عورت سے کیا گفتگو کرے۔ ان کی دلچسپیاں الگ، مشغلے الگ، سوچ الگ، وہ کچھ بے چین سا ہو جاتا۔ اور لطیفے سُنانے لگتا۔ مہرو اُسے اچھی لگتی تھی۔ وہ اس سے قریب ہونا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا ضرور تھا کہ مہرو کے پاس بیٹھے، بات چیت کرے، اس کے ساتھ وقت بتائے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیسے۔ اظہار کا اُسے ایک ہی طریقہ آتا تھا۔ وہ تو بس ہاتھوں، آنکھوں اور ہونٹوں کے ذریعے ہی پیار کا اظہار کرسکتا تھا اور مہرو کو اس سے اتنی ہی الجھن ہوتی تھی۔

"پن مہرو تو جانے چھے کہ I LOVE YOU مہرو تم جانتی ہو کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" جمی نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"ہوں پن اے قبول کرو چھو۔ پن اے تو ماری بات نو جواب نتھی" (میں جانتی ہوں، لیکن یہ تو میری بات کا جواب نہیں)

مہرو نے اسے بالکل کارنر کر دیا۔

جمی نے مہرو سے کہا کہ مجھے اپنی غلطی قبول ہے مگر کیا اس میں کوئی خامی نہیں؟ کوئی کمی نہیں؟"

اب مہرو کے چپ ہونے کی باری تھی۔ جب سے اس نے ماڈلنگ شروع کی تھی، وہ ایک عجیب سی کشمکش میں گرفتار ہو گئی تھی، مگر اس وقت وہ یہ سب سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جمی کا مزاج بچّوں کا سا ہے۔ اُس نے جمی کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرنی شروع کیں۔ اُس کی آنکھوں پر گالوں پر بوسے دیتے۔ اسے جمی کی ساری کمزوریاں معلوم تھیں۔ جمی تمام تر مزاحمت کے باوجود ڈھیر ہوتا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر میں جمی خراٹے لے رہا تھا۔ مگر اس کا سوال مہرو کے ذہن میں اب بھی گونج رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ جمی سے اس کی شکایتیں بجا، مگر کیا وہ خود پوری طرح بری الذمہ تھی۔ کالج کے دنوں میں ہی جب وہ اپنے عکس کو ایک خوبصورت، چنچل اور دلربا انداز میں اخباروں، رسالوں، اشتہاری فلموں سے جھانکتے دیکھتی تو اسے شک ہوتا کہ یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ یہ رُوپ اس کا نہیں ہے۔ وہ تو ایک بالکل سیدھی سادی سی معمولی لڑکی تھی۔ کہیں لان پر یا کسی چوراہے پر اسے تصویر کھنچوانی ہوتی اور لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی تو اسے بڑی کوفت ہوتی۔ یہ لوگ اسے کیوں گھور رہے ہیں۔ کیا دنیا میں اور چیزیں نہیں۔ جسم کی نمائش۔ کیا اس میں سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں۔ ساری نگاہیں بس اس کے جسم کو کھوندتی رہتی ہیں۔ یہ فوٹو گرافر، یہ جب تک میرے ایک ایک عضو کو خوب اچھی طرح ٹٹول نہیں لے گا تصویر نہیں کھینچے گا۔ یہ بے وقوف سمجھتے کیوں نہیں کہ میں محض ایک جسم نہیں، ایک انسان ہوں — ایک شخص۔ پتہ نہیں کب یہ جھنجھلاہٹ خوف میں بدل گئی۔ وہ اس ماڈل گرل سے ڈرنے لگی جو اس پر قابض ہو گئی تھی۔ ان دنوں اس کی ایک تصویر بہت مقبول ہوئی۔ تصویر اگرچہ ساحل کے قریب ہی پتھروں کے درمیان کھینچی گئی تھی۔ مگر فوٹو گرافر نے اس خوبی سے اسے فوکس کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیچ سمندر میں کسی دُور افتادہ مقام پر ہے۔ سمندر کی لہریں اس کے جسم سے ٹکراتی ہیں۔ اور جھاگ جھاگ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی بیوٹی سوپ ہے جو وہ نزاکت سے لگا رہی ہے۔ اس تصویر میں وہ بہت خوبصورت گرد و پیش سے بے نیاز نظر آتی تھی۔ کسی ملکۂ حُسن کی طرح اس کے عُریاں جسم کو سمندر کی لہروں اور جھاگ نے لپیٹ لیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ جسم کی رنگت کا بریزیر اور زیر جامہ پہنے ہوئے تھی۔ مگر دھند، لہروں اور روشنی کی وجہ سے اس کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ جمی اسی تصویر کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوا تھا۔ اپنے بیڈ رُوم کی ساری دیواریں اس نے مہرو کی تصویروں سے بھر دی تھیں۔ شادی کے بعد مہرو نے سب سے پہلے ان تصویروں کو ہٹوایا تھا۔ کیونکہ تصویروں کے درمیان لیٹے ہوئے اسے بارہا التباس ہوتا کہ جمی اس کے ساتھ نہیں بلکہ ان تصویروں کے ساتھ محوِ اختلاط ہے۔ بلکہ تصویریں ہٹوا دینے کے بعد بھی اس کے ذہن کے گوشے سے یہ خیال ضرور پھنکارتا اور اچانک وہ بے جان ہو جاتی۔ اس کی ساری دلچسپی جاتی رہتی۔

اگلی صبح جی کا موڈ بڑا شاندار تھا۔ اس نے شیریں کے ساتھ خوب باتیں کیں۔ مہرو کو دیر تک وہ اپنی دہرہ دون ٹرپ کے متعلق بتاتا رہا۔ بلکہ اس نے تجویز پیش کی کہ اگلی بار گرمی کی چھٹیاں کلو منالی کی وادیوں میں گزاری جائیں۔ مہرو نے اس تجویز پر صاد کیا۔ آج وہ لیفٹ مین کو دیکھ کر مسکرانا نہیں بھولا بلکہ اسے ایک اونی ٹوپی بھی تحفتاً دی۔ جو اس کے علاقے سے مخصوص تھی۔

آفس میں کام کرتے ہوئے ایک بار وہ کسی کام سے باہر آیا۔ تو سہراب اپنے کیبن داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔

"اے کاکڑہ کھاؤ۔" (اے کیکڑہ خور!) وہ آواز کو قدرے مہین کرتے ہوئے چیخا۔ سہراب غصے میں پلٹا۔ مگر اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"گانڈا، بن مانس، آوی گیو پاچھو (آ گیا واپس؟) اس نے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

واپسی میں مہتا راہداری میں کسی سے باتیں کرتا ہوا نظر آیا۔ تو اسے دھکا دیتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ کام کے دباؤ میں ایک دوسرے کی موجودگی سے واقفیت کے اظہار کا یہ ایک مانوس طریقہ تھا۔ اس کی ان حرکتوں سے اسٹاف کو بہر حال یہ اندازہ ہو گیا کہ آج جی کا موڈ بہت اچھا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ضروری کاغذات پر دستخط حاصل کرنے کے لیے اس کے کیبن پر بھیڑ لگ گئی۔

دوپہر میں کچھ دیر کے لیے اسے راحت ملی تو اس نے کافی منگوائی۔ کافی پیتے ہوئے اسے مہرو کا خیال آیا۔ اور ساتھ ہی رات کی گفتگو بھی۔ مہرو کی باتوں میں صداقت تھی۔ یہ اس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ مہرو سے پہلے بھی جن لڑکیوں سے اس کی دوستی ہوئی تھی وہ اسی لیے ختم ہو گئی تھی کہ لڑکیاں اس کے والہانہ انداز اور اس کے جسمانی اظہار سے تنگ آ کر بھاگ جاتی تھیں۔ دو ایک نے تو اس سے صاف صاف کہا تھا کہ اس کا ذہن بستر سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں پاتا۔ اس کے ساتھ مستقل دوستی ممکن نہیں۔ اب یہی بات اگر مہرو بھی کہہ رہی ہے تو کیا غلط ہے۔ ممکن ہے تنگ آ کر وہ بھی اسے چھوڑ دے۔ حالانکہ اسے فی الحال اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اس تصور سے ہی اسے خلجان ہونے لگا۔ مہرو کو وہ کسی قیمت پر نہیں کھو سکتا تھا۔ اس نے طے کیا کہ اپنے معاملات کی اسٹاک

میکنگ کیے بہت دن ہو گئے۔ اب اسے اور نہیں ٹالا جاسکتا۔ اسے اب دوسری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اُسی وقت اُس نے طے کر لیا کہ وہ مہرو کو ہفتے میں ایک روز سے زیادہ پریشان نہیں کرے گا۔ صبر تو اس کے لیے کہاں ممکن تھا، مگر ہاں دوسرے ذرائع بہت تھے اور یہ اُس کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

اسی موڈ میں اُس نے بہروز کو فون کیا۔ اور اسے بتایا کہ وہ اس کی تجویز کو مناسب ریمارکس کے ساتھ ڈائرکٹرس میٹنگ میں بھیج رہا ہے۔ مِس بہروز بہت خوش ہوئی اور اس نے بار بار اس کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد اُس نے مہرو کو ٹیلی فون کیا کہ وہ رات دیر سے آئے گا۔ کھانے پر وہ انتظار نہ کرے۔

رات گیارہ بجے وہ گھر پہنچا تو بچی سو چکی تھی۔ مہرو حسبِ معمول غزلیں سُن رہی تھی۔ اس نے غزلوں میں دلچسپی ظاہر کی۔ مہرو سے مشہور غزل گایکوں کے نام دریافت کیے۔ اُس کا کیسٹوں کا ذخیرہ دیکھتا رہا، مہرو کو تعجب تو ہوا۔ مگر وہ خاموش رہی۔ صبح مہرو کا موڈ بہت اچھا تھا۔ تکان کی کیفیت جو صبح اس کے چہرے پر ہمیشہ رہتی تھی اسے نظر نہیں آئی۔ اپنے فیصلے پر اُسے خوشی ہوئی۔ وہ مہرو کو خوش اور چاق و چوبند دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ نیا انتظام کئی دن تک خوش اسلوبی کے ساتھ چلا۔ مگر اس میں کئی خامیاں تھیں۔ ایک تو شام میں مہرو اور بچی کے ساتھ کھانے کا موقع نہیں ملتا تھا جو اُسے پسند تھا۔ دوسرے مہرو سے ملاقات بس رات ہی میں ہوتی تھی۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ وہ سیدھا دفتر سے گھر آجاتا۔ رات کے کھانے تک مہرو اور بچی کے ساتھ رہتا۔ پھر کسی بہانے غائب ہو جاتا۔ دو ایک بار وہ مہرو کو لے کر شام کی سیر کے لیے بھی نکلا۔ مہرو واقعی خوش ہوئی۔ اگرچہ رات میں اس کا غائب ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ کچھ تو عادتاً اور کچھ اس خیال سے کہ اب وہ انھیں زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا تھا اُس نے جمی سے اس کے متعلق دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اپنی کامیابی پر وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ شیخ نے بھی اس کی کارگزاری کی داد دی۔ مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ منصوبے کے مطابق ہفتہ کی رات تک اسے مہرو سے الگ رہنا تھا۔ مگر جمعہ کی صبح سے اُس کا جسم پھوڑے کی مانند دُکھنے لگا۔ دن میں کئی بار مہرو کا ہیولا اُس کے سامنے آیا اور گیا۔ دوپہر تک اس کا موڈ پھر خراب ہو چکا تھا۔ اسے رہ رہ کر مہرو

پر غصّہ آنے لگا۔ یہ سالی برف جیسی عورت کیا میرے ہی نصیب میں تھی؟ آخر اور بھی تو عورتیں ہیں۔ شام تک اس کا سر ہلکے ہلکے دکھنے لگا۔ غصّہ تو اُسے اتنا آرہا تھا کہ جی چاہا سیدھے کلب چلا جائے۔ مگر خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے گھر کا رُخ کیا۔

مہرو نے چائے لا کر دی۔ جمی چائے پی کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

"کیم طبیعت برو بر نتھی؟" (کیوں طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟) مہرو نے پوچھا۔

"ماتھو بھاری بھتئ گیو چھے۔" (سر بھاری ہے) جمی نے جواب دیا۔

مہرو اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر گود میں رکھ کر ہاتھوں سے ہلکے ہلکے دبانے لگی۔ اس دوران اس کی بچی شیریں اس کے پاس آئی۔ جمی نے اُسے پیار کیا۔ کچھ دیر باتیں کیں۔ پھر مہرو نے اسے باہر بھیج دیا کہ پپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم باہر کھیلو۔

جمی کو مہرو پر بہت غصّہ تھا۔ مگر اسے اتنے قریب پا کر وہ سب کچھ بھول گیا۔ مہرو سر دباتے دباتے اُس پر جھکی۔ اس کے بالوں کو آنکھوں کو چوما۔ اس کی آنکھیں مہرو سے چار ہوئیں تو مہرو کی آنکھوں میں شرارت جھانکتی نظر آئی۔

"شوں چھے؟" جمی نے سر گھما کر اس سے پوچھا۔

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں"

جمی نے پھر سر رکھ دیا۔ مگر تبھی اُسے خیال آیا کہ مہرو محض میکسی پہنے ہوئے ہے۔ وہ بے سُدھ لیٹا رہا۔

"ناراج چھے مارا اوپر؟" (ناراض ہو مجھ سے؟) مہرو نے جھک کر اس کے کانوں میں کہا۔

"نئیں تو۔" جمی نے کہا۔

تبھی مہرو نے اپنی بانہوں میں اسے سمیٹ لیا۔

"آو چھو نتھی؟" (آؤ گے نہیں؟)

"REALLY"

"تو اے وی ریتے رہے چھے تے منے سارو لاگتو نتھی۔" (تم اس طرح رہتے ہو تو مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا) مہرو نے کہا۔

آ بدھو ہوں تاری خاطر ج کروں چھوں۔" (یہ سب میں تمہاری خوشی کے لیے ہی تو کر رہا

ہوں)

"ایٹیلچ تومنے اسے گھنوج کھراب لاگے چھے۔" (اسی لیے تو مجھے بہت بُرا لگتا ہے) مہرو نے کہا۔" ہے نارو نیچرل بیہویر نتھی۔" (یہ تمہارا فطری برتاو نہیں)

"پن مارو نیچرل بیہویر تیارے کیو وپسند پڑے (لیکن میرا فطری رویہ تمہیں کب پسند ہے۔)

"BUT I NEVER COMPLAINED" مہرو نے کہا۔" توج مارا اُپر اکھڑے چھے" (تم ہی مجھ پر غصّہ کرتے ہو)

یہ کہتے کہتے وہ جمی کے پہلو میں لیٹ گئی۔ جمی بڑی دیر سے خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اب اس کے لیے ناممکن تھا۔

اُس نے مہرو کو بھینچ لیا۔

تب مہرو نے اُس سے کہا کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی اسے اچھا لگتا ہے۔ وہ بھی اُسے اسی طرح قبول کرلے۔

رات میں کھانے کے بعد جمی لیٹا تو اس کا سر بالکل ہلکا تھا۔ نائٹ لیمپ کی ہلکی روشنی میں مہرو بینیاز کی غزلیں سُن رہی تھی۔ اس وقت اسے بینیاز کی آواز بڑی میٹھی، سریلی لگی۔ جیسے آواز کا جھرنا دھیرے دھیرے بہہ رہا ہو۔ مگر وہ ایک بار پھر کنفیوز تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

۵۰

# نیا فرمان

راج محل میں غیر معمولی ہما ہمی تھی۔ کچھ دیر قبل جاری کیے گئے فرمان نے سب کو ششدر کر دیا تھا۔ لوگ ٹکڑیوں میں بڑے جوش و خروش سے گفتگو میں مصروف تھے۔ بوڑھے راج کوی محل کے مدور ستون سے ٹیک لگائے سامنے خلا میں تک رہے تھے۔ ان کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ جیسے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ نئے فرمان کے مطابق ہر شخص کا رول تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور راج کوی کو اگلے روز سے مسخرے کا رول کرنا تھا۔ راج کوی کو مسخرے کا رول!!

کیا وہ استعفا دے دیں؟ لیکن وہ سرکاری مکان میں رہ رہے تھے، ان کے تصرف میں سرکاری گاڑی تھی اور دربار سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان کے سینکڑوں کام بنتے تھے۔ دربار سے تعلق ختم ہونے کی صورت میں ان کی ساکھ آدھی بھی نہ رہ جاتی۔ راجدھانی میں مکان بھی تو بہت مہنگے تھے۔ اس کے علاوہ استعفا دینے کے بعد ان کے فنڈ اور گریجویٹی کی بڑی رقم نئے مکان کی خرید میں لگ جائے گی۔ اس کے برعکس ریٹائر ہونے کی صورت میں جس میں اب مشکل سے دو سال باقی تھے، ان کی پنشن مقرر ہونا یقینی تھا۔ تب تک ان کے لڑکے کی تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی اور اپنے اثر و رسوخ سے وہ اسے کہیں نہ کہیں لگا سکتے تھے۔ بڑی لڑکی کی شادی کی بات چیت بھی چل رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس تقریب کی تصویر اخبار کے پہلے صفحے پر چھپے اور یہ تب ہی ممکن تھا جب وہ راج محل سے وابستہ رہتے۔

تھکے تھکے قدموں سے وہ محل سے باہر آئے۔ ان کا ڈرائیور جو دوسرے ڈرائیوروں کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا، انھیں دیکھ کر لپکا اور فوراً گاڑی دروازے پر لے آیا۔ راج کوی راستے بھر کھوئے کھوئے رہے اور اس وقت چونکے جب ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

اپنے ڈرائنگ روم میں پہنچنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک صوفے پر گم سم سے بیٹھے رہے۔

اور شاید دیر تک بیٹھے رہتے اگر مترنم گھنٹی کی آواز انہیں چونکا نہ دیتی۔ خادم نے اطلاع دی کہ راج ودھوشک تشریف لائے ہیں۔ مسخرا! پندرہ سال سے محل سے وابستہ رہنے کے باوجود جس شخص سے ان کی کبھی رسمی گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی، ان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ انہوں نے خادم کو اشارہ کیا کہ وہ راج ودھوشک کو بھیج دے۔

مسخرا کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کو خاموشی سے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے رہے۔ مسخرے کا اوٹ پٹانگ لباس اور ہیئت کذائی دیکھ کر انہوں نے تاسّف سے سوچا۔ کیا کل انھیں بھی اسی حالت میں لوگوں کے سامنے جانا ہوگا؟ راج کوی جن کے پُروقار شائستہ کلاسیکل لہجے کی راجدھانی میں دھوم تھی۔ جن کے کھڑے ہوتے ہی مجمع کی سرگوشیوں کی بھن بھن رک جاتی تھی۔ کیا لوگ کل ان پر ہنسیں گے؟ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے مسخرے کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

"یہ تو غضب ہوگیا کوی جی" بالآخر مسخرے نے خاموشی کو توڑا۔ "میں تو خواب میں بھی کبھی سنجیدہ نہیں ہوا۔ راج کوی کا رول میں کیسے کر سکتا ہوں؟"

راج کوی نے اس کے غمگین چہرے کو بغور دیکھا، انھیں محسوس ہوا کہ اس وقت دونوں کا دُکھ ایک سا ہی ہے۔ مسخرا سچ ہی تو کہہ رہا ہے۔ راج کوی کا رول وہ کیسے کر سکتا ہے؟ ہزار ہزار اشعار کی نظمیں وزیراعظم کی خدمت میں پیش کرنا، ملک کے اہم واقعات اور محل کی ممتاز شخصیتوں پر نظمیں کہنا اور وہ بھی کلاسیکی انداز میں کوئی آسان کام ہے؟

ڈرائنگ روم کی تین دیواروں پر لگی تین وزیراعظموں کے ساتھ کھنچوائی گئی اپنی تصویروں کو وہ پیار بھری نظروں سے تھپکنے لگے۔ یہ تصویریں ان موقعوں کی تھیں جب انہوں نے پندرہ پندرہ سو اشعار کی نظمیں ان مہان شخصیتوں کی شان میں کہہ کر سفید دبیز چکنے کاغذ پر آفسیٹ پریس میں چھپوا کر اور حری جلد سے آراستہ کرنے کے بعد یہ نفس نفیس راج محل میں پیش کی تھیں۔ ایک مرصع بک شیلف پر اُن کے چار مجموعے ایسے ہی شاندار چھپے نمایاں طور سے رکھے تھے جن میں محل کی ہر ممتاز شخصیت اور اہم واقعے پر ان کی نظمیں تھیں۔

"آپ فکر نہ کریں ودھوشک جی" انہوں نے فراخ دلی سے کہا۔ "آپ کو جب بھی ضرورت ہو، آپ بلا تکلف مجھ سے نظمیں لے جائیں۔ میں آپ کے لیے لکھ دیا کروں گا۔"

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ مسخرے نے کہا۔ "اگر میرے لائق آپ کوئی خدمت

مناسب سمجھیں تو ہر وقت حاضر ہوں۔"

"آپ کی تو ہمیں بڑی ضرورت پڑے گی۔" راج کوی نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے کہا:
"ہم راج ودھوشک کا رول آپ کی مدد کے بغیر کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارا جسم اتنا بھاری بھرکم ہے، ہمارے لیے تو ہلنا جُلنا بھی دوبھر ہوتا ہے۔"

"اس کی فکر نہ کریں۔" مسخرے نے تسلی دی۔ "میں آپ کو چند یوگا ورزشیں سکھادوں گا اور پھر آپ دیکھیے گا، مہینوں نہیں بلکہ دنوں میں آپ کا جسم کیسا چُست پُھرتیلا ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی عمر سے بھی دس سال چھوٹے نظر آئیں گے۔"

"بس اتنا کافی ہوگا؟" راج کوی نے پوچھا۔

چند لطیفے اور ان کی ادائیگی کا انداز میں آپ کو سمجھادوں گا۔ رفتہ رفتہ آپ خود لطیفے گھڑنا سیکھ جائیں گے۔ آپ کے لیے یہ کون سی مشکل بات ہے؟" مسخرے نے کہا۔

"پھر بھی میری تو ہمت نہیں پڑتی۔ راج کوی دربار میں مسخرے کا رول ادا کرے۔ بُرا نہ ماننا، یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں کوی جی۔" مسخرے نے کہا۔ "اب تو مجبوری ہے۔ شاید یہی ہماری ٹریجڈی ہے کہ ہم دوسرے رول نہیں جانتے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے رول پھر بدل جائیں۔ فرمان میں بھی تو کہا گیا ہے کہ وقفے وقفے سے مزید احکامات جاری کیے جائیں گے۔"

راج کوی کے مایوس دل میں امید کی کونپل نے سر اُبھارا۔ انہوں نے سوچا "مسخرہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح یہ تھوڑے سے دن کاٹ دینے چاہئیں۔

مسخرا چلا گیا اور راج کوی پھر اداس نگاہوں سے سامنے کی دیوار کو تکنے لگے قسمت نے ان کے ساتھ کتنا بھیانک کھیل کھیلا تھا؟ تیس سال قبل جب وہ اپنے گاؤں سے آئے تھے تو راجدھانی کے لوگ ان کے دیہاتی لباس، لب ولہجے اور رہن سہن کا مذاق اڑاتے تھے۔ برسوں کی محنت کے بعد راج کوی بنے تھے۔ انھیں دیکھ کر آج کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص تیس سال قبل ایک ان گھڑ دیہاتی تھا۔ قلم کی ایک جنبش نے انھیں پھر تحت الثریٰ میں پہنچا دیا تھا۔

اگلے روز وہ دربار پہنچے تو کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ لوگوں نے جب راج کوی کو مسخرے

کارول اداکرتے دیکھا تو باوجود اس کے کہ وہ اپنا رول بہت ہی بے دلی اور بھونڈے پن سے کررہے تھے ---- ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ایسی توہین ان کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کا بس چلتا تو زمین میں دھنس جاتے۔

اسی طرح مسخرا جب اپنا مستعار کلام سُنا رہا تھا تو لوگ احتراماً ہنس تو نہ سکے لیکن ہر چہرہ مسکراتا ضرور نظر آیا۔ راج کوی کے پڑھنے کے انداز کی اس نے بڑی خوبی سے نقل کی جس کی داد خود راج کوی نے بھی دی۔

مسخرے نے سچ ہی کہا تھا۔ وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ دن تیزی سے گزرتے چلے گئے۔ راج کوی نے بے دلی سے ہی سہی لیکن اپنے نئے رول کو قبول کر لیا۔ اُن کی صحت واقعی بہتر ہوتی چلی گئی۔ وہ کافی چاق و چوبند نظر آنے لگے۔ چہرے کی جھرّیاں گھٹ گئیں۔ اب وہ گھر پر بھی ہنسی مذاق کرتے۔ گھر کا ماحول جو ہمیشہ کچھ گمبھیر سا رہتا تھا، بدل گیا۔ لوگ راج کوی کے گھر آتے اور مزاحیہ نظموں کی فرمائش کرتے جسے وہ پورے بھاؤ سے سُناتے۔ راجدھانی کے ہر مشاعرے میں ان کی شرکت لازمی ہوگئی۔ اس طرح ان کی آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگیا۔ دربار میں بھی ان کے پارٹ کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا۔ خود مسخرے نے انھیں کئی بار بے ساختہ داد دی۔ وہ خود البتہ مسخرے سے کچھ کترانے لگے تھے۔ وہ جب بھی ملتا زبان و بیان اور حیات و ممات کے ایسے ادق مسئلوں پر گفتگو چھیڑ دیتا جن سے اب ان کی طبیعت الجھتی تھی۔ اب وہ خود نظمیں کہنے لگا تھا۔

زندگی پھر ایک ڈھرے پر چل پڑی تھی کہ وزیر اعظم کے مشورے پر بادشاہ نے گدّی ولی عہد کو سونپ دی کہ ان کی زندگی ہی میں وہ حکومت کرنے کا سلیقہ سیکھ جائے۔ اور ایک بار پھر سب کے رول بدل دیے گئے۔ راج کوی کو پھر ایک بار خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنا پڑا۔ یہ جان کر خود انھیں بھی تعجب ہوا کہ راج کوی کا رول ان کے لیے اب اس قدر پرکشش نہیں رہا تھا۔ ان کی صحت پہلے سے کہیں بہتر تھی اور زندگی کے بقایا دن وہ ہنسی خوشی گزار دینا چاہتے تھے۔ ہزار ہزار مصرعوں کی نظمیں کہنے کو اب ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔

مسخرے کے لیے بھی اپنا پُرانا رول دوبارہ کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہنستا بھی تو لوگوں کو گمان گزرتا کہ رو رہا ہے۔ چند ایک نے کوشش بھی کی کہ راج کوی کو دوبارہ مسخرے کا پارٹ دیا جائے، لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔

راج کوی کافی ہر دلعزیز ہو گئے تھے ۔ وزیر اعظم کی نجی صحبتوں میں بھی انھیں باریابی حاصل ہو چکی تھی ۔ اور انھیں توقع تھی کہ ان کے ریٹائر ہونے پر جس میں چند ہی مہینے رہ گئے تھے وزیر اعظم ان کیلئے کوئی نہ کوئی جگہ نکال لیں گے اور پنشن بھی جاری ہو جائے گی۔

ایک دن دربار میں وہ پورے جوش وخروش سے اپنی نظم سُنا رہے تھے کہ وزیر اعظم نے انھیں ٹوکا کہ وہ مسخرے کا رول کر رہے ہیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟" انہوں نے کہا "میں نے راج کوی کا رول ہمیشہ اسی طرح کیا ہے ۔"

"شاید آپ نے نوٹس بورڈ نہیں دیکھا ۔" وزیر اعظم نے کہا ۔ "نئے احکامات کے مطابق اب راج کوی کے پارٹ کو مسخرے کا اور مسخرے کے رول کو راج کوی کا رول کہا جاتا ہے ۔"

راج کوی غش کھا کر گرے اور اُٹھ نہ سکے ۔ ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی ۔

# بول بچن

اللہ قسم، جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مرتی رات ہے۔ چاند سامنے ہے۔ چائے کی پیالی ٹیبل پر رکھی ہے۔ بڑے بڑے پیر اولیاء کا کہنا ہے کہ عورت جات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے بول بچن کے آگے اچھے اچھے آدمی مات کھا جاتے ہیں۔ دوسروں کی بات کیا، میں اپنی بولتا ہوں۔ مگر میں سالا میں بولوں گا تو تو بولے گا کہ ممّو جھوٹ بولتا ہے۔ مگر ماں قسم، جندگی میں اپن نے ایک سے ایک لڑکی گھمایا۔ تو کھالی لڑکی دکھا دے میرے کو۔ اللہ قسم، پٹا کے نہیں دکھا دوں تو نام بدل دینا۔ مگر یار سچّی بات تو یہ ہے کہ آج تک اپنے کو بھی یہ عورت جات سمجھ میں نہیں آئی۔

ابھی چار سال پہلے کی بات بتاتا ہوں۔ جمعرات کا دن تھا۔ درگاہ پر سے قوالی سُن کر باہر آیا تو بس اسٹاپ پر میرے سامنے ایک بنئے نے جاکٹ سے پاکٹ نکالا۔ جھاڑی کیا تو سَو سَو کے نوٹ کی گڈی! میں نے پہلے ہی چاروں کونے دیکھ لیا کہ رستہ کلیر ہے۔ سڑک پر ایک بھی کُتا نہیں تھا۔ بس آئی۔ لائن تو تھی نہیں، میں اُس کو چپک گیا۔ جیسے ہی گاڑی چالو ہوئی، اللہ قسم جھوٹ نہیں بولتا، یہ پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں ہے۔ مکھے سے بال بھی کوئی اتنی صفائی سے نہیں نکالے گا، جتنی صفائی سے میں نے اُس کی بنڈی میں سے پاکٹ نکالا۔ لیکن سالے ستارے ہی گردش میں ہوں تو کوئی کیا کرے؟ اسی ٹائم ایک پارسی عورت نے کنڈکٹر کو ہاتھ دکھائی اور کنڈکٹر نے گھنٹی بجا کر بس کو روک دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بڈھی بس میں چڑھے گی اور میں اُترنے کے لیے چانس دیکھ رہا تھا۔ دروازے پر چار پانچ آدمی کھڑے تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے سرک رہا تھا۔ اب کیا بتاؤں، وہ تو سالی بس میں چڑھتے ہی میرا ہاتھ پکڑلی اور بولی: ام ابھی دیکھا، تم وہ بنئے کا پاکٹ مارا۔ ارے اس کی تو... ...میں بڑھیا کا ہاتھ جھٹکا اور نکلا۔ مگر دروازے پر ایک تگڑا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے کہا: "کیا؟" اور

میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ پھر یار مت پوچھ وہ دُھلائی ہوئی ہے، وہ دُھلائی ہوئی ہے کہ بس! میں تو آج یہ لوگ اپنے کو جندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مگر نصیب سے ایک کُتا آگیا۔ میں نے اُس کو آنکھ مارا کہ یار جان بچا۔ وہ میرے کو لے گیا گلی میں۔ بولا: "سالے، تیری لائن نہیں اِدھر، پھر تو کیوں آیا؟ ہشیاری دکھاتا ہے؟" دو روپے جھاڑ کر وہ تو نکل گیا، مگر میری حالت کھراب۔ سالا چلا نہیں جاوے۔ ایک ڈاکٹرنی ڈپنسری بند کر رہی تھی۔ میرے کو دیکھ کر معلوم نہیں اُس کو کیا رحم آیا کہ میرے کو ڈپنسری میں لے گئی۔ مرہم پٹی کی۔ دوا دارو سے کچھ جان میں جان آئی۔ مگر یار، وہ لوگ نے اتنی بُری طرح مارا تھا میرے کو کہ سالا ہاتھ بھی اٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے خود ہی قمیض کے بٹن لگائی۔ سالا اس کے تریا چرتر تھے، کیا تھے، معلوم نہیں۔ بٹن لگاتے لگاتے وہ میرے اتنے قریب آگئی کہ میرے کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ گورا گورا ڈنلوپلو کے مافک بدن۔ لوکٹ بلاؤج۔ میرے کو دیکھ کے مسکرائی۔ پوچھی: آپ کا نام؟ میں چوالیس انچ کی چھاتی پھگا کر بولا: ممتاز الرحمٰن کھان۔ بولی: اتنا لمبا نام تو ہم نہیں بول سکتا۔ میں دل میں بولا: جانم، تم تو اپنے کو کھالی ممّو بول دو تو ایک بار تو ملک الموت کی چھٹی کر دوں کہ سیانے آٹھ دن بعد آنا۔ ابھی اپنے کو مرنے کی پھرست نہیں ہے۔ میں اُس کو بولا: سب لوگ میرے کو ممّو بولتے ہیں۔ وہ پھر ہنسی۔ سالی کے دانت تھے کہ موتی کی لڑی۔ بولی: ممّو! ہاؤ سوئیٹ! یہ اچھا ہے۔ آپ کل آؤ شام میں ڈریسنگ کے واسطے۔

اللہ قسم، جھوٹ نہیں بولوں گا مسجد سامنے ہے بس یہ سمجھ لے کہ اِدھر میں اچھا ہوتا گیا اور اُدھر وہ بیمار ہوتی گئی۔ دو دن نہیں جاؤں تو بے چین ہو جاوے۔ لیکن یار، ایک بات ہے میں سمجھتا تھا کہ جتنا تجربہ اپن کو ہے کیا کسی کو ہوئے گا۔ مگر اُس کے آگے میرے کو لگا کہ سالا میں ابھی بچہ ہوں اُس کے سامنے۔ ماہر تیراک کیسا سانس روک کے ایک ایک گھنٹہ پانی میں رہتا ہے۔ میں تو پاگل ہو گیا اُس کے سامنے۔ لیکن یار، وہ بھی سوچتی ہوئے گی، ممّو بھی کوئی چیج ہے، کوئی ہستی ہے۔ ایک دن میرے کو بولی: ممّو، ڈرائیونگ آتی ہے تم کو؟ نہیں تو سیکھ لو۔ میں تم کو اچھی پگار دوں گی۔ میں بولا: جانِ من، گلامی کرنی ہوتی تو گھر کیوں چھوڑتا؟ گھر پر کیا کمی تھی میرے کو؟ میرے باپ کی تین تین لاری چلتی تھی۔ انگلش اسکول میں پڑھتا تھا۔ اب سالا سوچ، گھر میں کسی کو اے بی سی ڈی معلوم نہیں اور انگلش اسکول میں ڈال دیا۔ فورتھ تک جیسا تیسا پڑھا پھر دو سال فیل ہو گیا۔ تو باوا بولا اسکول چھوڑ دو کام سیکھو۔ میں بھی سوچا چلو جان چھوٹی۔ مگر باوا میرے کو بولتا ہے: کلینر بن کے جاؤ گاڑی پے۔ میں بولا: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو فورتھ تک پڑھا ہے۔ تمہارے ڈرائیور میں تو کوئی اتنا بھی نہیں پڑھا۔

وہ بولا: ہم بھی جب کام سیکھا تو ایسا ہی سیکھا تھا۔ آدمی نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ یہ میرا حکم ہے۔ میں بولا سالا یہ جھک جھک کون پالے۔ گھر ہی چھوڑ دیا۔ تو بجو، میں اس کو بولا: ممّو کسی کی سروس نہیں کر سکتا۔ مگر تیرے کو تو معلوم ہے، عورت کے بول بچن ایک بار شروع ہو گئے تو ہو گئے۔ وہ بولتے ہیں نا سدا چاندنی رات اچھی نہیں۔ چھ مہینے میں نے بہوت مجا کیا۔ اُس کو میرے بنا چین نہیں اور میرے کو اُس کے بنا چین نہیں۔ مگر ایسی عورت کا کیا ہے، اس کو تو نیا نیا مال چاہیئے۔ تھوڑے دن اچھے سے رہے، پھر بول بچن شروع ہو جائے۔ میں سمجھ گیا۔ اس کا دل اب بھر گیا۔ اس کو اب نئی چیج چاہیے۔ اپن سمجھتے تھے، اس کو اپن پٹائے ہے، مگر یار اصل معاملہ تو اُلٹا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایسا کھیل رہی تھی جیسا بلّی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے تو میں بھی بولا: ممّو چل بیٹا، تو نے بہوت مجا کر لیا۔ اب چلتا بن اور اُس کے ساتھ جیادہ دن رہنا اچھا بھی نہیں۔ اور سچّی، اگر میں چھ مہینے اور اس کے ساتھ رہتا نا تو وہ میرے کو چوس ڈالتی۔ تو بجّو سوم سے اپن نے بھی لائن بدل دیے۔ قسم سے جھوٹ نہیں بولتا۔ مرتی رات ہے۔ چاند سامنے ہے یہ تعویج گلے میں ہے۔ وہی ٹائم ایک اور لفڑا ہو گیا ــــ اے ٹیبل والے جا چائے لا! پانی کم۔

ہاں تو میں کیا بولا؟ ایک گجراتی لڑکی تھی۔ ایسی مُردار کہ ایک ایک ہڈی گن لو۔ گلی میں کھیلتی تھی۔ سالا کبھی اپنا اُدھر دھیان بھی نہیں گیا۔ پھر اپنا ایک اصول ہے۔ محلّے میں لفڑا نہیں کرنے کا۔ مگر یادا کی قسم کھا کر بولتا ہوں، سالا چھ مہینے میں کیا دیکھتا ہوں تو کیا سے کیا ہو گئی۔ انگ انگ اللہ معلوم کدھر کدھر سے بھر گیا۔ سونے کے مافک جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ چال ایسی مست جیسی شراب کی اکھی بوتل پیے ہی ہو۔ وجینتی مالا کو دیکھا ہے نا؟ بس اُس کو چھپاؤ، اس کو نکالو۔ اللہ قسم، پھر بھی میں بولا گلی کا معاملہ ہے۔ بتیس سال ہو گئے سالا کبھی گلی میں لفڑا نہیں کیا اپن نے۔ مگر ایک دن سالا میں ناکے پہ کھڑا تھا۔ یہ پاس ہوئی چلتے چلتے نجر اُٹھا کے میرے کو دیکھی اور منہ چھپاتی، ہنستی شرماتی ہرنی کے مافک نکل گئی۔ میرے کو سکتہ ہو گیا نا۔ میں پھر بھی بہت کنٹرول کیا۔ مگر سالا اس کو دیکھو تو کبھی گیلری میں کھڑی ہے۔ میں گلی میں رہوں تو سالی دس بار پاس ہوئے۔ اب اس کو تو کیا بولے گا؟ انکم ٹیکس آپیسر کی لڑکی۔ پھر گلی میں ایک سے ایک لڑکا ہے۔ تو بجّو، عورت کا بھروسا نہیں۔ پسند آوے تو بھنگی کے ساتھ نکل جاوے، نہیں تو راجہ کو بھی ہکال دے کہ تیری کیا ہستی ہے، تو سمجھ لے کہ سال بھر میرا اس کے ساتھ لفڑا چلا۔ پھر وہ اڑ گئی کہ ممّو میرے کو ادھر سے لے چل۔ ادھر میرا جی نہیں لگتا۔ اس کے بول بچن سن کے اپنے تو پیر کے نیچے سے جمین نکل گئی۔ اپنے رہنے کا ادھر ٹھکانا نہیں، اُس کو کہاں رکھتے؟ پھر اپنی

کیا شامت آئی تھی کدھر راجہ بھوج اور کدھر گنگو تیلی۔

ابھی یہ چکر سالا چل ہی رہا تھا کہ اس کے باپ نے کسی پیسے والے کے ساتھ اُس کی بات پکی کر دیا۔ میں اس کو بہوت سمجھایا کہ چلی جا۔ جند گی بھر کھوش رہے گی۔ اپنا کیا؟ بنی تو بنی، نہیں تو عبدالغنی۔ وہ تو میری جان کھا گئی کہ ممّو شادی کروگی تو تیرے ساتھ، نہیں تو سمندر میں کود کے مرجاوں گی۔ میں اُس کو بولا: کم سے کم ماں باپ کی عجت کا تو کھیال کر، بھول جا میرے کو۔ مگر اُس کو تو اپنی عجت کا داتو لاکونے کا تھا۔ ایچ رٹ کہ میرے کو لے چل۔ یہ پھوکٹ کی آپھت گلے میں پڑی۔ اس لیے لوگ بولتے کہ گلی میں لفڑا نہیں کرنے کا۔ گھرگرہستی کا لفڑا اپن نے جندگی میں نہیں پالا۔ اس کو کدھر لے کے جاؤں۔ کچھ کر بیٹھے تو بدنامی الگ۔ ایک دن اُس کے باپ کو بھی معلوم ہوگیا۔ وہ پہنچا اُستاد کے پاس۔ اُستاد میرے کو پکڑا۔ بولا: محلّے میں رہنے کا ہے کہ نہیں؟ جی میں تو آیا کہ اُستاد کو بھی اُلٹا ہاتھ دوں۔ اپنے سے کوئی گرم بات کرے تو اپنا تو مستک پھر جاتا ہے۔ اپن اپنے باپ کی نہیں سُنا تو پھر دوسرے کی کیا ہستی ہے؟ مگر استاد کا اپنے اوپر بہوت احسان ہے۔ اپنے کو لڑکے سے بڑھ کر چاہتا ہے۔ پھر اپنا گرو ہے۔ میں اُستاد کو بولا: کیا کروں؟ میں تو خود پیچھا چھڑانے کو دیکھتا ہوں، مگر وہ مانے تب نا؟ اُستاد بولا: تو یہ میرے پہ چھوڑ دے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں کیا کھا کر جان دیں گی۔ وہ سالا ہمارے جمانے میں ہوتا تھا۔ تو سالا عورت کے بول بچن میں کیسا آگیا؟

اُستاد نے تو نرالا ہی بندوبست کیا نا۔ دو دن کے بعد دیکھتا ہوں تو پولیس چلی آرہی ہے۔ ایک مارواڑی کا پاکٹ مارا تھا۔ لمبا ہاتھ تھا۔ میں سمجھا اُستاد سنبھال لے گا، مگر وہ تو الگ ہوگیا۔ جندگی میں پہلی بار محلّے سے برات نکلی۔ گیلری میں سے اپنی معشوقہ بھی دیکھ رہی تھی۔ میرا بس چلتا تو جمین میں گھس جاتا۔ اُستاد بولا: تو پھکر مت کر۔ چھ مہینے بعد آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس ٹائم اپنے دماغ میں بتی جلی کہ یہ سب اُستاد کی چالو گری ہے۔

لگے دن میرے کو معلوم پڑا کہ اپنی معشوقہ بہت روئی دھوئی۔ لیکن سچی یار، چھ مہینے کے بعد میں واپس آیا تو اس کی شادی ہو چکی تھی۔ ایک دن دیکھا کہ گلی میں آرہی ہے اپنے میاں کے ساتھ۔ کھوش کھوش۔ ڈبل لگتی تھی۔ میرے کو دیکھ کر مونہہ گھمالی جیسے کیسٹر آئل پی لی ہو۔ میں بولا: ممّو سالے، تو جندہ دفن ہو جا۔ تھو ہے تیری جندگانی پہ۔ اس کے بعد میں ایک گھنٹہ بیٹھا، مگر وہ گیلری میں نجر نہیں آئی۔ تو سالے، یہ ہے عورت کی جات۔ ایک دن اکیلے میں ملی تو میں نے پکڑ لیا۔ مُونڈی جھکا کر رونے لگی۔ میں کیا کرتی؟ میرے ماں باپ نے جبردستی میری سادی کر دی۔ میں اکیلی عورت جات کیا کر سکتی تھی؟

میں بولا: جا سالی، یہ بول بچن رہنے دے۔ ممو کو کیا پروا ہے؟ وہ تیرے پہ تھوکتا بھی نہیں۔

مگر یار، یہ ریٹا تو میرے کو نچا ڈالی۔ اس کے لیے میں کیا نہیں کیا۔ مگر ایک نجر ڈالنے کو تیار نہیں۔ اس کا رباب بھی گیا تھا۔ صبح صبح کمپنی کی گاڑی آکر لے جاتی۔ شام کو چھوڑ کر جاتی ــــ باہر والے! ذرا دو چائے لا۔ فرسٹ کلاس۔ ملائی ڈال کر لا۔

یار، خدا کی قسم، جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مرتی رات ہے۔ چاند سامنے ہے جندگی میں پہلا ٹائم میں پیر ساب کو بولا: باوا کچھ کرو میرے لیے۔ یہ سالی ریٹا تو دیکھنے کو بھی تیار نہیں۔ ممو آج تک جندگی میں ہار نہیں مانا۔ پیر ساب بہوت دیر سوچے پھر بولے: ایک عمل ہے۔ اگر تو چار جمعرات بھی کر لے تو کام بن جائے۔ مگر قبرستان میں آدھی رات کے بعد جانا پڑے گا۔ میری تو سُن کے ہی رُوح فنا ہو گئی۔ میں بولا: باوا کچھ اور بتاؤ۔ ابھی میرے کو جندگی بھاری نہیں ہے۔ پھر بہوت دیر سوچے۔ دو تین کتاب نکال کے پڑھے پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے: دیکھ، یہ عمل ہے۔ چالیس دن کر لے۔ معشوقہ اکتالیسویں دن پیر نہ پڑے تو میرا نام بدل دینا۔ میں بولا: باوا، وہ تو برابر ہے، مگر اپنے ساتھ پاکی ناپاکی کا بھی تو چکر ہے۔ بولو تو مولبی ساب کو بٹھا دوں پڑھنے کو۔ پیر ساب بولے: یہ عمل خود کرنا پڑتا ہے۔ میں سوچا کوئی بات نہیں۔ ممو بھی کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ہے۔ اپنے بول بچن کے آگے تو پتھر بھی پانی ہو جاوے لڑکی کیا چیج ہے، لیکن یار، قسم سے جھوٹ نہیں بولتا، مسجد سامنے ہے۔ یہ چائے کا کپ ہاتھ میں ہے۔ جتنے پینترے معلوم تھے، سب آجما لیا، مگر وہ معلوم، نہیں سالی کس مٹی کی بنی تھی کہ دیکھنے کو ہی تیار نہیں ہوئی۔ جندگی میں یہ پہلی بار مات ہو رہی تھی۔ اپنا تو موڈ آف ہو گیا۔

ایک دن میں حوالدار جوشی سے بات کرتے کھڑا تھا کہ یہ پاس ہوئی۔ میں اُس سے بولا: یار، اس کو پٹانے کی بہوت کوشش کیا، سالی ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتی۔ وہ ہنسنے لگا۔ بولا: ہیرو، یہ تو کال گرل ہے، کال گرل! میرا تو دماغ ہی پھر گیا نا۔ ممو نے اچھی اچھی لڑکی کو گھاس نہیں ڈالا اور یہ سالی کال گرل کا اتنا بھاؤ! میں جوشی سے بولا: کیا بولتا ہے یار! میں تو سُنا کوئی صابن کمپنی میں کام کرتی ہے؟ ہاں اور ساتھ میں یہ دھندا بھی ہے۔ وہ تو سالا میرے کو بھی نہیں معلوم پڑتا۔ مگر ایک دن کمشنر ساب میرے کو نمبر دیا۔ بولا: جوشی، یہ نمبر پر فون تو کر۔ کمشنر ساب کی گاڑی اس کو دیکھا تو سب سمجھ میں آگیا۔

بس یار پھر کیا تھا۔ جوشی کی بات سُن کر دل کھوش ہو گیا۔ دوسرے دن میں شام میں

ریٹا کی کمپنی میں پہنچ گیا۔ وہ جیسے ہی کمپنی کی گاڑی میں بیٹھی۔ میں بولا: ریٹا۔ ہاؤ آر یو؟ وہ میرے کو دیکھ کو مسکرائی۔ بولی: ممو تم! اللہ قسم، جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مرتی رات ہے۔ چاند سامنے ہے۔ میرے کو تو سکتہ ہو گیا نا تو یہ اپن کو پہچانتی ہے؟ میرے کو بولی: آؤ ممو، گاڑی میں بیٹھو۔ ڈرائیور نے درواجا کھول دیا۔ میری تو حالت ہی کھراب۔ دل ہوتا تھا کہ بھاگ جاؤں، مگر پیر ہلنے کو تیار نہیں۔ ایسے جام ہو گئے تھے۔ میں بھی چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چلی تو میں سوچا، معلوم نہیں کدھر لے جاتی ہے۔ ڈرائیور کو وہ انگلش میں کچھ بولی۔ اُس نے گاڑی کو گھمایا۔ میں دیکھا گاڑی کولابہ جارہی ہے۔

ایک سنسان گلی میں ایک ایر کنڈیشنڈ ہوٹل کے سامنے جاکر گاڑی رکا۔ ریٹا اُتری اور اُس کے پیچھے میں۔ ڈرائیور میرے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ سالا یہ کون نیا افلاطون ہے۔ وہ میرے کو لے کے ایک کیبن میں گھُسی۔ میرا دل تو ہوائی جہاز کے پنکھے کے مافک گھوم رہا تھا۔

"کیا لوگے ممو؟" وہ بولی۔

"چائے۔" میں بولا۔

"وہسکی نہیں پیتے تم؟"

"نہیں!" میں بولا۔

تھوڑی دیر میں ویٹر چائے لے کر آیا۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولی: "ممو، میں جانتی ہوں تم مجھے پسند کرتے ہو۔ مجھے بھی تم اچھے لگتے ہو۔ تم واقعی ہینڈسم بھی ہو اور اسٹرانگ بھی۔ جب میں تم کو پہلی بار دیکھی تھی، جب ہی تم مجھے اچھے لگے تھے۔ لیکن شاید تم کو معلوم نہیں کہ میں کون ہوں؟"

میں نے مونہہ کھولا۔ مگر آواج حلق میں ہی پھنس گئی۔ وہ بھی تاڑ گئی۔ "تو تم کو معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔ تم ہی بتاؤ ایسی لڑکی کو کون پسند کرے گا؟"

"میں پسند کرتا ہوں۔" میں بولا۔ "آپ بولو تو میں ابھی سادی کے لیے تیار ہوں۔ اُس ٹائم سچی میں ایسا ہی پاگل ہو گیا تھا اُس کے لیے۔"

پھر اُس نے میرے کو بہوت لمبی اسٹوری سُنائی اُس کے باپ نے اپنے دھندے کے لیے اُس کو کیسا کیسا استعمال کیا۔ پھر اُس کو ہارٹ اٹیک ہوا تو بھائی لوگ نے بجنس لے لیا۔ اس کا ایک آدمی سے لفڑا ہوا۔ اس نے اُس کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنایا۔ وہ تو پہلے ہی

ے بال بچے والا تھا۔ تھوڑے دن رکھا پھر اُس نے بھی اپنے کام کے لئے اس کو سپلائی کرنا چالو کر دیا۔ سالا میرے کو سُن کر بہوت دُکھ ہوا۔ میں بولا: کوئی بات نہیں۔ ممّو ابھی بھی سادی کو تیار ہے۔ یار وہ تو رو دی نا۔ بولی: ممّو، تم بہوت دیری سے آئے۔ میرے تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بولی۔ تم کو معلوم نہیں میری جندگی بہوت کم ہے۔ میرے کو تو گھگھی چھوٹ گئی۔ پھر اس نے میرے کو بتائی کہ اُس کا باس مہینے میں پندرہ دن بنکاک میں رہتا ہے اور تین مہینے سے بمبئی نہیں آیا۔ میں بولا: مگر اس سے آپ کو کیا مطلب؟ بولی: اس کو ایڈز ہو گیا۔ میرے تو سالا کچھ سمجھ میں نئیں آیا۔ پھر وہ میرے کو سمجھائی کہ یہ کتنی خطرناک بیماری ہے — سالا میرا تو عشق ہی ہو گیا نا؟ وہ بولی: میرا خون بھی ٹیسٹ کرنے کو دیا ہے۔ میرے سرکل میں سب کو معلوم ہو گیا ہے۔ پندرہ دن سے میرے کو ایک بھی فون نہیں آیا۔

یار، اس کے لیے جو منگتا، میں کرنے کو تیار تھا۔ مگر جان کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ یہ تو رنڈیا کی شکل میں ملک الموت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں سوچا کب چانس ملے اور میں بھاگوں۔ مگر یار جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ماں قسم، مسجد سامنے ہے۔ یہ تو مرنج گلے میں ہے۔ رات کو سونے کو لیٹا تو میرے کو بہوت سرم آئی۔ میں بولا: ممّو تھُو ہے تیری جندگانی پہ! اسا ے عشق اس کو بولتے ہیں؟ تیرے کو یقین نہیں آئے گا، لیکن یہ ٹیبل والے بچے کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولتا ہوں کہ اس کے بعد میں اُس سے چار پانچ بار ملا۔ آخری ٹائم جب میرے کو ملی تو بولی: ممّو سب نے میرے کو چھوڑ دیا۔ مگر تم میرے سے برابر ملا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ یہ پیار و یار سب بکواس ہے۔ جب باپ نے بیچ دیا۔ یار نے دھندے سے لگا دیا پھر دنیا میں آدمی کس پہ بھروسا کرے؟ مگر ممّو، میں تم کو کبھی نہ بھولوں گی۔ میرے بس میں ہوتا تو اپنا سب کچھ تم کو دے دیتی۔ مگر تم کو تو معلوم ہے، میرے کو چھُونا بھی پاپ ہے۔

اللہ قسم، چاند سامنے ہے، مسجد میں اذان ہو رہی ہے، میرا دل ہوا کہ اس کو گلے سے لگاؤں۔ میں آگے بڑھا بھی۔ مگر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ یار، اس کے بعد پتہ نہیں وہ کدھر غائب ہو گئی۔ چھ مہینے ہو گئے۔ اب بھی رات میں آنکھ کھُلتی ہے۔ تو قسم سے پہلے اُس کا ہی خیال آتا ہے۔ پتہ نہیں، جندہ ہے کہ مر گئی۔ اسی لیے تو بولتا ہوں کہ یار، عورت کی جات کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ بڑے بڑے پیر اولیا ر گلت تھوڑے ہی نا بولتے ہیں۔

چھوڑ یار، اپنا موڈ تو آف ہو گیا۔ مگر ٹھہر جا، ایک ایک کپ چائے اور مار

لیتے ہیں۔ نئیں تو گلے والا ہوئے گا: سالا دو دو گھنٹے پھوکٹ میں ٹیبل گھیر کر بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ تو پنکھے کا بل ہو جاتا ہے — اے کریم، دو چائے تو لا جلدی سے — اور ہاں دو گلاس پانی بھی ✤

# اجنبی/مانوس رہ گذر

ہر شخص کے دل میں ایک خواہش ہوتی ہے۔ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے، جب وہ سوچتا ہے کہ سارے بندھن توڑ کر کہیں نکل جاتے۔ اپنے عزیز واقارب، دوست احباب، بیوی بچوں کے تنگ گھیرے سے باہر آئے کہ اس وسیع وعریض دنیا میں چند سانس آزادی کے لے سکے۔مگر ایسا ہوتا نہیں۔ دن بہ دن لہو سرد ہوتا جاتا ہے۔ اُڑتے ہوئے پرندوں، چکرلتے بادلوں کو وہ اب بھی دیکھتا ہے، کسی قدر حسرت سے، مگر اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب لحد تک یہ مٹی اسے چھوڑنے کی نہیں۔ کبھی کبھی اسی جذبے کے تحت وہ بیوی بچوں کو لے کر کسی انجانے شہر، کسی تفریحی مقام کے لیے نکلتا بھی ہے مگر اس سے اس کی تسکین نہیں ہوتی کہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ سارے جھمیلے تو اس کے ساتھ ہی ہیں۔
مگر ظفر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ بچپن سے اس کی عادت تھی گھنٹوں سڑکوں پر اکیلے مارے مارے پھرنا۔ چیزوں کو حیرت سے تکنا۔ گرمیوں کے دن آتے، درختوں پر پھول نظر آتے تو وہ سویرے سویرے نکل پڑتا۔ چلتے چلتے پیر دُکھنے لگتے تو کہیں۔ بنچ دیکھ کر۔ بیٹھ جاتا یا کسی ریستوران میں چائے پینے چلا جاتا۔بارش شروع ہوتی تو اسے گھر میں چین نہیں آتا۔ وہ گلی میں ہوتا یا کسی پارک میں چھتری کے نیچے۔ جاڑوں میں دو چار دوستوں کو ساتھ لے کر رات گئے تک کسی گوشے میں آگ جلا کر گپ شپ کرتا رہتا۔ گھر پر ڈانٹ پڑتی، اُستاد آنکھیں دکھاتے، مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔اپنی اس آوارہ مزاجی کے باوصف جب والد کے انتقال کے بعد اسے دفتر کی ملازمت اختیار کرنی پڑی تو وہ ہچکچایا نہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی خاطر اس نے کوشش کر کے جلد از جلد ملازمت حاصل کی۔ اور گھر کے سکون کو برقرار رکھا۔ انھیں اسکول جاتے دیکھتا، اپنی معصوم خوشیوں میں انھیں منہمک دیکھتا تو فخر سے اس کا سر اونچا ہو جاتا۔ محلے کے لوگ اس سے اسی احترام اور محبت سے ملتے جس طرح اس کے والد سے ملتے تھے۔ وہ یقیناً صحیح راستے پر تھا مگر اس کے باوجود کئی بار ایسا ہوتا کہ صبح آنکھ کھلی تو اسے احساس ہوتا کہ موسم تبدیل

ہو رہا ہے۔ درختوں پر بور آگئے ہوں گے۔ سڑکیں پھولوں سے ڈھک گئی ہوں گی۔ یا وہ دفتر نکلنے کی تیاری میں ہوتا۔ اور تیز بارش ہونے لگتی۔ اسے وہ پارک یاد آتے جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ وہ پرسکون گوشے! اس کا دل چاہتا کہ وہ اڑکر وہاں پہنچ جائے مگر وہ اپنی طبیعت پر جبر کرتا۔ دفتر میں اس کی سالانہ رپورٹ بہت اچھی تھی۔ حاضری: باقاعدہ، مزاج: ملنسار، برتاؤ: عمدہ، ڈرافٹنگ: عمدہ۔ اپنا ریکارڈ وہ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا افسروں میں اس کی عزت بنی رہے۔ بھاری قدموں سے وہ بس اسٹاپ پر آکر کھڑا ہو جاتا۔ دفتر پہنچ کر وہ حاضری کے مسٹر (MUSTER) پر دستخط کرتا تو اس کے اندر کوئی چیز پھڑپھڑاتی جیسے باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہی ہو۔ دستخط کرتے ہی اسے محسوس ہوتا کہ اب وہ شام تک کے لیے قید ہو گیا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ اس کی نظر کھڑکی سے باہر نیلگوں فضا کو پرواز کرتی اور وہ دیر تک فضا میں لہراتے، آوارہ سفید و سیاہ بادلوں کو تکتا رہتا یہاں تک کہ کوئی ساتھی اس سے مخاطب ہو کر اسے دوبارہ دفتر کی فضا میں لے آتا۔

ستائیس سال اسی طرح گزر گئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ دفتر سے مانوس ہو گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہر چیز قابلِ اطمینان۔ پیسے جوڑ کر اس نے نیا مکان لے لیا تھا۔ بھائی بہنوں کی شادی کروا دی تھی۔ اب اس کے اپنے لڑکے بڑے ہو گئے تھے۔ بڑا لڑکا کالج میں تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ خوش ہوتا مگر پتہ نہیں کیوں اس کے اندر سے جیسے جینے کی اُمنگ ہی چلی گئی تھی۔ صبح اُٹھتا تو اس کا بدن پتھر کی طرح بھاری ہوتا۔ اٹھتے اٹھتے اسے آدھ پون گھنٹہ لگ جاتا۔ تھوڑی دُور چلتا تو پیر ایسے دکھنے لگتے جیسے وہ میلوں چل کر آیا ہو۔ اس نے کئی بار اپنا طبی معائنہ کروایا تھا مگر ہر بار ڈاکٹروں نے اس کی صحت اطمینان بخش بتائی تھی۔ ہر چیز نارمل تھی۔ انھوں نے اسے بار بار وٹامن اور فولاد اور دوسرے ٹانکوں پر ڈالا تھا، مگر بے سود۔

آخر ایک دن چھٹی لے کر وہ اپنے ایک اسکول کے ساتھی کے پاس گیا، جو اب ڈاکٹر تھا۔ اپنے دوست سے مل کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ اسے اپنے پُرانے دن یاد آئے۔ دونوں دیر تک بیتی یادیں تازہ کرتے رہے۔ اس نے طبی رپورٹیں دیکھیں۔ خود اس کا معائنہ کیا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کے پاس بھیجا جو سائکیاٹرسٹ تھا۔

چار روز بعد وہ اس سائکیاٹرسٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے دیر تک اس سے سوالات پوچھے۔ بچپن کے متعلق، والدین کے متعلق، بھائی بہنوں کے بارے میں۔ چار روز بعد پھر بلایا۔ اس طرح کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے سامنے روشن تھا۔ لیکن سائکیاٹرسٹ بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ حل کہیں آس پاس ہی کہیں ہے۔

اور پھر ایک دن -

جب بیگ ہاتھ میں لیے جس میں روزانہ اخبار کے علاوہ توشہ دان اور ڈاکٹر کی دوائیں بھی تھیں اور ایک مقبول عام ناول بھی ۔ وہ بس کی قطار میں کھڑا تھا، تو اس نے تعجب سے دیکھا کہ اس کے پیر اسے بس کی قطار سے باہر لے آئے ہیں اور وہ کچّی سڑک پر ہے۔ کئی بار اس نے سوچا بھی کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے۔ مگر وہ بس چلتا چلا گیا۔

اس کے پیر دکھنے لگے تھے۔ مگر جیسے اسے پتہ چل گیا تھا کہ اب پیچھے ہٹنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا۔ تھکے پیروں کو آرام دینے کے لیے وہ ایک ڈھابہ نما چائے خانے کے باہر رکھی بنچ پر بیٹھ گیا چائے پیتے ہوئے جیسے پہلی بار وہ اپنے اطراف کے ماحول سے آگاہ ہوا۔ کچّے پکّے مکانات، غلاظت کے ڈھیر کو سونگھتا کُتا، اناج کی دکان پر منہ مارتی بکریاں، میلے کچیلے مزدور، اسکول جاتی لڑکیاں خوش پوش مرد عورتیں، بہت دنوں کے بعد اس طرح کھلی آنکھوں سے ہر گوشے کو وہ دیکھ رہا تھا اور اسے اچھا لگ رہا تھا۔ بستی کے اب وہ بالکل کنارے پر تھا۔ بنچ پر بیٹھے بیٹھے اس نے دور نظر دوڑائی۔ بستی جہاں ختم ہوتی تھی وہاں سے کھیت شروع ہوتے تھے۔ لیکن کھیتوں کا سلسلہ بہت مختصر تھا کیونکہ اس کے بعد ہی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ بس تھوڑی ہی دیر کی بات ہے اور وہ بستی کے باہر ہوگا۔ اس نے سوچا اور اس کا دل خوشی سے لبریز ہوا تھا۔ پیروں سے تھکن جیسے غائب ہوگئی۔ وہ اٹھا اور چائے کے پیسے دیتے ہوئے بڑی خوش دلی سے بولا:

"بھئی چائے خوب بناتے ہو، مزہ آگیا۔"

"کرپا ہے مہاراج کی۔" اس نے جواب دیا۔

جب وہ کھیتوں سے گزر رہا تھا تو اس نے سوچا کہ شاید جب گوتم کپل وستو سے نکلا ہوگا، تب ایسے ہی احساسات اس کے بھی ہوں گے۔ لیکن جب گوتم نے شہر چھوڑا تھا تب اسے پتہ تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔ مگر اسے تو معلوم تھا کہ وہ ضرور لوٹے گا۔ گوتم جتنا جگرا اس کے پاس نہیں تھا اور کیا پتہ گوتم جب نکلا ہو تو خود اس کا ارادہ ایسا ہی ہو۔ اس نے سوچا ہو کہ بس چند روز جنگل میں گزار کر وہ گھر لوٹ آئے گا۔ علاوہ ازیں گوتم نے جب گھر چھوڑا تھا، وہ کس قدر کم عمر تھا۔ ادھر اس کی عمر سینتالیس سال کی ہو رہی تھی۔ اعضا جواب دے رہے تھے۔ گھر سے کتنے برس وہ جکڑا رہا؟ کیا یہ موہ آسانی سے نکل سکتا ہے۔ لیکن اسے بہرحال خوشی تھی کہ بالآخر وہ گھر، دفتر، دوست، احباب کے جکڑ سے باہر نکل آیا تھا۔ اب چاہے یہ کتنی ہی دیر کے لیے ہو۔

چلتے چلتے جب وہ پہاڑیوں کے درمیان آیا تو ہوا ہی بدل گئی۔ خشک مگر خوشگوار ہوا کے جھونکے بار بار اس کے قدموں سے لپٹ جاتے۔ وہ قدم آگے بڑھاتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی شفیق باپ اپنے پیروں کو اپنے کمسن بچے کی باہوں سے چھڑا رہا ہو۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ساری فکریں، ساری تھکان جیسے بستی میں رہ گئی تھی۔ اسے یہ ماحول بہت اچھا لگا۔ اس نے سوچا اس ماحول کا لطف لینا چاہیے۔ ایک چوڑا سا پتھر دیکھ کر اس نے رومال نکالا۔ پتھر پر سے مٹی جھٹکی اور رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔ پانی کی چھاگل تھرماس یا کوئی اور چیز ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُسے خیال آیا۔ ہوا کے جھونکے اسے اس قدر پیار سے سہلا رہے تھے کہ اس کا دل چاہا لیٹ جائے۔ اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے خوشگوار منظر کو دیکھا جیسے اسے اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتا ہو۔ پھر پیر پھیلا کر دراز ہونے جا ہی رہا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں میں کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ وہ چونکا۔ پہلی بار اسے خوف سا محسوس ہوا۔ ابھی تک اکا دکا کووں کے علاوہ کوئی اور پرندہ یا جانور اسے نظر نہیں آیا تھا۔ وہ جنگل یا ویرانوں کا باسی تو تھا نہیں کہ اسے کچھ پتہ ہوتا۔ وہ کچھ دیر اس جگہ کو گھورتا رہا جہاں سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی تھی۔ مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے ہوا سے پتے کھڑکھڑائے ہوں یا گلہری وغیرہ رہی ہو۔ اس نے بستی سے نکل کر غلطی تو نہیں کی ہے۔ ہوا اب بھی خوشگوار تھی۔ دور نیلگوں کلۂ ابر یونہی بے مقصد گردش میں تھے۔ پہاڑ بدستور خاموش با تمکنت اپنی جگہوں پر متمکن تھے۔ مگر اس کا دل اندیشوں سے غبار آلود ہو چلا تھا۔ اس نے نظریں دوڑائیں۔ دور تک کسی متنفس کا پتہ نہ تھا، نہ کسی بستی کے آثار۔ شاید اس کے اندیشے بے جا تھے۔ وہ فطرت کی دلنواز آغوش میں تھا۔ ابھی دن کا ایک طویل حصّہ باقی تھا۔ اگر ایسے دن اس کی زندگی میں اور بھی آتے ہوتے تو شاید وہ اس طرح خوف نہ کھاتا۔ اس کے خوف کی وجہ ناتجربہ کاری تھی، بس۔

وہ اٹھا اور پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ باوجود اتنا چلنے کے آج اسے تھکان بالکل نہیں محسوس ہو رہی تھی! پیر اب بھی چلنے کے لیے آمادہ تھے۔ اس کا دل خود بخود گنگنانے کو چاہنے لگا۔ لیکن اسے کوئی ایسا گانا یاد نہیں آیا جو اسے کبھی بہت پسند رہا ہو۔ حالانکہ بچپن میں چلتے چلتے بھی گانے کی عادت تھی۔ ایک گانا تھوڑا سا یاد آیا اور ابھی وہ دھن ٹھیک سے یاد کر ہی رہا تھا کہ پھر کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اُس نے پھر اس جگہ نظر دوڑائی جہاں سے آواز آئی تھی۔ مگر سوکھے پتوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ اس سے واقعی کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس نے سوچا۔ اسے اس طرح نکلنا نہیں چاہیے تھا۔ اس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ اور آس پاس کی تمام صداؤں سے خود کو

بے نیاز کر لیا۔ اب وہ چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچ جائے۔ جہاں بستی کے کچھ آثار ہوں۔ دھوپ کی تمازت بھی اب اسے پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔ پہاڑ اب بھی اتنے ہی فاصلے پر تھے اور راستہ بہت دور تک بل کھاتا ہوا، ان کے درمیان کہیں کھو گیا تھا۔ چلتے چلتے ایک بار کنکروں پر اس کا پیر رپٹا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ تب ہی ایک عجیب بات ہوئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے پیچھے چلتے چلتے کوئی رکا ہو۔ اس کا دل حلق میں آ پھنسا۔ لٹیرے تو نہیں؟ اُس نے رکے بغیر کلائی پر بندھی گھڑی اُتاری اور پتلون کی چور جیب میں سرکا دی۔ اس نے سوچا لٹیرے ہیں تو پھر کئی ہوں گے۔ تصدیق کے لیے وہ چلتے چلتے رکا۔ اپنے پیچھے اس نے بالکل واضح طور پر قدموں کی چاپ سُنی جو لحظہ بھر بعد بند ہو گئی۔

سورج اب سر پر آ چکا تھا۔ زوروں کی بھوک لگی تھی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ مگر رکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ چلتا رہا جیسے چلنے ہی میں خیریت ہو۔ چلنے ہی میں عافیت ہو۔ قدموں کی چاپ کئی بار اس نے صاف سُنی۔ پیروں کا درد پھر ابھر آیا۔ اس نے سوچا لٹیرے اس کے پیچھے ہیں تو اس پر حملہ کیوں نہیں کرتے؟ شاید وہ اس کے تھکنے کا انتظار کر رہے ہیں کہ آسانی سے دبوچ سکیں۔ اسے نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ جھنجھلا کر اس نے سوچا کہ وہ مُڑ کر ان سے دو دو ہاتھ کر ہی لے۔ ایک آدھ سے تو وہ نمٹ ہی سکتا ہے مگر کئی ہوئے تو؟ پھر بھی کیا حرج ہے۔ کم از کم اس تکلیف دہ صورتِ حال سے تو نجات ملے گی۔ ابھی وہ مڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ یہ جان کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ اس کے آگے بھی کوئی چل رہا ہے۔ کہیں بھوک اور پیاس کی شدّت سے اس کا ذہن بے قابو تو نہیں ہو گیا؟ ابھی وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کیا کرے کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ اس سے تھوڑی ہی دور ایک شخص جھاڑیوں سے نکلا اور گر پڑا جیسے غش آ گیا ہو۔ اس کے چہرے سے بھوک اور پیاس کے آثار ہویدا تھے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس شخص کو سہارا دے کر بٹھایا۔ اس کی چھاگل سے پانی کے چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکائے۔ اس شخص کی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ اس نے تشکّر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک کمزور مسکراہٹ اس کی ہونٹوں پر مچلی۔ اس نے توشہ دان کھول کر اس کے سامنے رکھا۔ ساتھ ساتھ اپنا کھانا بھی نکال لیا۔

ابھی انہوں نے دو چار لقمے ہی لیے ہوں گے کہ انھوں نے دیکھا کہ راستے پر لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے آگے بھی اور پیچھے بھی درختوں، جھاڑیوں کے عقب سے اکا دکا آدمی

باہر آرہا تھا۔

انھوں نے روٹی کھائی اور درخت کے سایے تلے آرام کرنے لگے۔ ہوا کے ہلکے جھونکوں سے اسے نیند آنے لگی۔ تندا سی آنکھوں سے دور تک پھیلا ہوا راستہ، اس پر چلتا اکا دکا آدمی، درختوں کا سلسلہ، خوشگوار ہوا، سرسبز ماحول بڑا سہانا معلوم ہو رہا تھا۔

تازہ دم ہو کر وہ اٹھا۔ دور تک پھیلے راستے کو اس نے دیکھا تو کچھ مانوس سا معلوم ہوا۔ جیسے ایک بار پھر وہ کسی پامال راستے پر چل رہا ہو۔

# چھاپ تلک

یکایک وہ ٹی وی کے شیشے پر نمودار ہوئی ہے۔
آسمانی رنگ کے تیراکی کے لباس میں وہ ڈرائیونگ بورڈ پر کھڑی ہے۔ اس کا دودھیا جسم بالکل بے حس و حرکت ہے اور نظریں جھکی ہوئیں۔ جیسے کوئی راہبہ مصروفِ دعا ہو۔
دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا ہے۔ پھر زخمی پرندے کی مانند سینے میں پھڑپھڑانے لگا ہے۔
اچانک اس نے قلابازی کھائی ہے۔ اور فضا میں ٹھہر گئی ہے۔ پھر بڑی آہستگی اور اور رچاؤ کے ساتھ شیشے میں تحلیل ہو گئی ہے۔

"SORRY, MICROWAVE RECEPTION WEAK"

کچھ دیر بعد لہروں کی رسد ٹھیک ہوئی ہے مگر اب نیوز ریڈر اپنے معمولی لب و لہجہ میں خبریں پڑھ رہی ہے۔
مرشد فرماتے ہیں، دنیا کی محبت سارے خطاؤں کی جڑ ہے۔ قلب کو ماسوا اللہ سے پاک کرنا، بس یہی مقصود ہے۔ فلاح پا گیا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔
پہلا سوال لازمی ہے۔ خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔ میں ذکی کو جواب نقل کروا رہا ہوں۔
غلط ــ اچانک میرے عقب سے ایک مترنم آواز آئی ہے۔ اور امتحان ہال سُریلی گھنٹیوں کی آوازوں سے گونج اٹھا ہے۔
سپروائزر چلتے چلتے رک کر مڑا ہے۔ دبیز شیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں تیزی سے جھپکنے لگی ہیں۔ سب ہنس پڑے ہیں۔ وہ خود بھی بوکھلا کر مسکراتے ہوئے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا ہے۔
پھر صحیح جواب کیا ہے۔؟ ذکی نے اس سے پوچھا ہے۔

اس کا جواب سُن کر میں نے فوراً چیک کیا ہے۔ اس کا جواب صحیح ہے۔
تھینک یو، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور ہم لوگ پھر مستعدی سے اپنے کام میں جُٹ گئے ہیں۔
امتحان ہال سے باہر آتے ہی ہم دونوں خوب ہنستے ہیں۔
نام کیا ہے یار اس کا؟ میں نے ذکی سے پوچھا ہے۔
بورڈ پر تو فرحت عزیز لکھا ہوا ہے۔ چہرہ کچھ نیپالیوں جیسا لگتا ہے۔
چُپ بے۔
آواز البتہ یار بڑی لیک دار ہے۔
ہم لوگوں کو اس کا ذرا قرینے سے شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔
کوئی بات نہیں ابھی دیکھ لیتے ہیں۔
ہم دونوں نے اسے تلاش کیا، مگر وہ جا چکی تھی۔
خیر کل سہی۔
اگلے روز ہم ہال میں پہونچے، وہ اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔
کل آپ نے ہماری بڑی مدد کی، بولتے بولتے میرا گلا خشک ہو گیا۔
اس نے سر اُٹھا کر ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اور نظریں جھکا لیں۔ بڑی بڑی بیضوی آنکھیں اور دراز پلکیں دل کو کھوندتی چلی گئیں۔
اس کے آگے کچھ کہنے کی ہماری ہمت نہیں ہوئی۔ اور ہم چپ چاپ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔
کیا بات ہے آج ابھی تک تم باہر نہیں گئے۔ میری بہن پوچھ رہی ہے۔
کچھ دیر بعد جاؤں گا۔
کیوں؟
بس یوں ہی۔ میں نے خود کو صوفے پر پھیلا دیا۔
شاید دس بجے کی خبروں میں وہ شارٹ پھر آئے گا۔
سعید۔؟
کیا ہے۔؟

تمہارے دوست بلا رہے ہیں ۔
ان سے کہو، میں کچھ دیر بعد ملوں گا ۔ ذرا مصروف ہوں ۔
اچھا ۔!
آج تیراکی کے مقابلے میں رفعت عزیز ـــــ
ایک بار پھر وہ تیراکی کے آسمانی لباس میں ڈائیونگ بورڈ کے تختے کے کنارے کھڑی ہے ۔
اچانک اس نے قلابازی کھائی ہے ۔ اور اسکرین بے تصویر ہوگیا ہے ۔
یہ بار بار لہروں کی رسد کیوں بگڑ جاتی ہے ۔
ٹھیک تو ہے ـــ تم اپنی آنکھوں کا معائنہ کروالو ۔
میں نے اپنی آنکھیں رومال سے صاف کی ہیں ۔
حسبِ سابق نیوز ریڈر اپنے معمولی لب ولہجے میں خبریں پڑھ رہی ہے ۔ یا الٰہی ، یہ ماجرا کیا ہے ۔ مرشد کہتے ہیں ۔ دل انسانی جسم کا قطب نما ہے جیسے قطب نما کی سُوئی کے بال برابر فرق پڑنے سے جہاز اپنی منزل سے میلوں دُور پہونچ جاتے ہیں ۔ اسی طرح انسانی قلب میں معمولی سا فرق آجائے تو ـــ
اسی لیے تو کہتی ہوں ۔ امّی کی آواز نے خیالات کا تسلسل توڑ دیا ہے ۔ ابھی امتحانوں سے فرصت ہوئی ہے ۔ اور ان کے رت جگے شروع ہو گئے ۔ دن بھر تو تم لوگ گپ شپ کرتے ہی ہو ۔ آخر ایسی کون سی باتیں ہیں ۔ جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں ۔
میں چپ چاپ اُٹھا ہوں اور بوشرٹ پہن کر چپل پٹختا ہوا باہر آگیا ہوں ۔
ابے سماع میں نہیں چلنا ہے ۔ ذکی پوچھ رہا ہے ۔
چلو، ہمیں تو آج کی شب پو پھٹنے تک جاگنا ہوگا اور سب کہاں چلے گئے ۔
وہ تو کب کے جا چکے ، میں تمہارے لیے اب تک رُکا ہوا ہوں ۔
تو چلو پھر ، سگریٹ ہے یا نہیں ؟
ہاں ، ہے میرے پاس ۔
محفل شباب پر ہے ۔
بندۂ عیب دار گس نخرد

باہزاراں گنہ خرید مرا،

ایک قلندر ہُوہُو کرتا ہوا کانپتے ہوئے اُٹھا ہے ۔ اور جھومنے لگا ہے ۔ باہزاراں گناہ خرید مرا، باہزاراں گنہ خرید مرا، قوال تکرار کر رہے ہیں ۔ سب کھڑے ہو گئے ہیں ۔ چند ایک نے قلندر کے گرد حلقہ باندھ لیا ہے ۔

باہزاراں گنہ خرید مرا ۔

رفعت عزیز تیراکی کے لباس میں قلا بازی کھاتے ہوئے فضا میں ساکت ہو گئی ہے ۔ ہیروں کی رسد ؟ کل آپ نے ہماری بڑی مدد کی اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا ہے ۔ اس کی بڑی بڑی بیضوی آنکھیں ــــ مرشد سے آنکھیں چار ہو گئیں ہیں ۔ قلب میں شعلے سے کیوں لپک رہے ہیں ۔ ؟

قوالوں نے دُوسری قوالی شروع کی ہے ۔

چھاپ تلک سب چھینی
موسے نیناں ملئے کے !

الا اللہ ، بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا ہے ۔

مرشد نے پھر میری طرف دیکھا ہے اور میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا ہوں ۔

چھاپ تلک سب چھینی ، موسے نیناں ملئے کے ، چھاپ تلک سب چھینی ، ہر چیز گردش میں ۔ مرشد ۔ احباب ، محفل ، قوال ، برقی قمقمے ، رفعت ، مرشد یا یہ میں گردش کر رہا ہوں ۔

چھاپ تلک ــــ مرشد
چھاپ تلک ــــ رفعت
چھاپ تلک ــــ مرشد
سب چھینی ــــ رفعت
سب چھینی ــــ رفعت
چھینی ــــ مرشد
چھینی ــــ مرشد
چھینی ــــ مرشد

مرشد، مرشد، مرشد، سب چھینی، مرشد، چھاپ تلک سب چھینی مرشد۔
آنکھیں کھلی ہیں۔ اور میں مرشد کے قدموں میں ہوں۔ مرشد میری پیٹھ تھپتھپا رہے ہیں۔

میں اُٹھ کر خالی خالی نگاہوں سے سب کو تکتا اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا ہوں۔

حضرت یہ آج آپ کو کیا ہوگیا۔ محفل بعد ایک قوال مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ آج تو آپ نے ہمارا گلا ہی سکھا دیا۔

واقعی؟ میں نے تعجب سے پوچھا ہے۔

اور نہیں تو کیا۔؟ ذکی کہہ رہا ہے۔ پریشان ہو گئے ہم۔ تمہیں سنبھالتے سنبھالتے۔

کیوں بھائی یہ آج تمہیں کیا ہوگیا؟ مرشد پوچھ رہے ہیں۔

کھینچ لیا آج مرشد نے۔ بہت ناز تھا کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ارے بڑا بدمعاش ہے یہ۔ مرشد کہہ رہے ہیں۔ اس پر اثر وثر کیا ہوتا۔ یہ کسی اور ہی دھن میں ہوگا۔ کیوں بھئی۔؟

ذہن بالکل سادہ اور شفاف ہے۔ بالکل خالی۔ سگریٹیں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ رات بھیگ چلی ہے۔ بھوک پوری شدت پر ہے۔ سنسان سڑکوں پر گھر لوٹتے ہوئے بس اپنے ہی قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ چھاپ تلک سب چھینی۔ یکایک ذکی نے ہانک لگائی ہے اور چپ ہو گیا ہے۔ لیکن گنبد کی صدا کی مانند یہ لفظ میرے خالی ذہن میں گونج اُٹھے ہیں۔ اور گونجتے چلے گئے ہیں۔

# حسرتِ حاصل

"دیکھ پپو، آج جیادہ ٹائم اپنے کو رُکنے کا نہیں ہے کیا۔ دو تین ڈھنگ کے جوتے پار کر کے نکل آئیں گے۔ کولا۔ نائیک یا کنگارو میں سے تو ایک بھی ہاتھ لگ گیا تو بس ہے" وکی نے پپو سے کہا، "آج موسم اچھا ہے۔ آٹھ دن سے سالا بارش نے موڈ کھراب کر دیا۔ آج آسمان صاف ہے۔ دھوپ بھی نکلی ہے۔ کرلا میں مال بیچ کر ریگل چلیں گے۔ ادھر 'نائٹ گیمس' چل رہی ہے۔"

"کرلا پر کیوں؟" پپو نے کہا۔ "ادھر چور بازار میں ہی آئیں گے۔ مال بیچ کر۔ پہلے دلّی دربار چلیں گے۔ آج میرا موڈ ڈبا گوشت اور بریانی کھانے کا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے" وکی نے کہا۔ "ادھر سے ریگل کے لیے بس مل جائے گی۔"

"آج نورانی کا قیمہ پاؤ بھی اچھا تھا۔" پپو نے کہا۔

"ہاں بیضہ اور ٹماٹر ڈالنے سے اس کا ٹیسٹ (TASTE) فرسٹ کلاس ہو گیا۔ سالا گھوٹالا اچھا بناتا ہے۔" وکی نے کہا۔

"میں کالج میں تھا تو میٹرو کے پاس چلیا کا ہوٹل ہے نا۔ اُدھر ہی ناشتہ کرتا تھا۔ آج بھی اس کے قیمے کا جواب نہیں۔" پپو نے کہا۔

"وہ چلیا کے ہوٹل کا نان پاؤ میں بھی بہوت پاس کیا ہوں" وکی نے کہا۔

"ایک جائے منگا کر میں بیٹھ جاتا تھا۔ مگر ٹیبل وہ ہی پکڑتا تھا جس پر بن پاؤ کی برفی ہوتی تھی۔"

"کڑکی کی وجہ سے؟"

"کڑکی تو یار تھی ہی۔" وکی نے کہا۔ "لیکن زیادہ مزا اڈوینچر میں آتا تھا۔"

"کسی کو شک نہیں ہوا کبھی؟" پپو نے پوچھا۔

"شک ہو جائے تو پھر کام میں مزا ہی کیا۔" وکی نے کہا۔ "ایسا ہو جائے تو پپو اپنا نام بدل ڈالے۔ دیکھ چار نمبر بس آرہی ہے۔"

"خالی ہے۔" پپو نے کہا۔ "اور وہ بھی سانتا کروز کی۔"

بس کے دھیمے ہوتے ہی دونوں لپک کر چڑھ گئے۔ اپر ڈیک پورا خالی پڑا تھا۔ صرف دو چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں آگے جاکر بیٹھ گئے۔

وکی اور پپو دونوں ہی جوتے اڑانے میں ماہر تھے۔ سویرے سات آٹھ بجے میونسپل ریڈنگ روم پہنچ جاتے۔ انگریزی اخبار میں جنم دن، اموات، برسی کے کالم غور سے پڑھتے۔ دوسری خبروں کا بھی اسی غرض سے مطالعہ کرتے کہ شہر کے کس مشہور تاجر، لیڈر یا فلمی شخصیت کو اوپر والے کا بلاوا آیا ہے۔ پھر اُن میں سے کسی مناسب مقام کا انتخاب کر کے وہ نکل پڑتے۔ اس وقت بھی وہ اشوک نام کے ایک فلم پروڈیوسر کے انتقال کی خبر پڑھ کر نکلے تھے۔ فلمیں تو اشوک نے دو تین ہی بنائی تھیں۔ مگر اُن کے حساب سے یہ بھی کافی تھا۔ پھر اس کی ایک فلم سیٹ پر تھی اس لیے ماتم گساران کی تعداد بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہ ہوگی۔ یہی سوچ کر وہ نکلے تھے۔

وکی کی شخصیت متاثر کن تھی۔ چھ فٹ کا قد۔ بھرا بھرا جسم۔ گندمی رنگ مگر کھلتا ہوا۔ نقوش بھی متناسب تھے۔ بریف کیس ہاتھ میں ہوتا تو لوگ کمپنی ایگزیکٹو سمجھتے۔ شیو ہمیشہ بنا ہوا ہوتا۔ قمیض پتلون بیش قیمت۔ پرانی چپل وہ صرف دھندے کے وقت پہنتا تھا تاکہ اُسے چھوڑ کر نیا جوتا پہن کر نکل آئے۔ سنیما دیکھنے یا تفریح کی غرض سے نکلتا تو سات آٹھ سو سے کم کا جوتا اُس کے پیروں میں نہیں ہوتا تھا۔ دو دو سونے کی وزنی انگوٹھیاں انگلیوں میں رہتیں۔ جوتے اڑاتے ہوئے کوئی دیکھ بھی لیتا تو اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وکی کو ٹوکے۔ جھجکتے ہوئے کوئی اُس طرف توجہ دلاتا تو وہ اور پھیل جاتا استعجاب کا اظہار کرتا کہ پھر میرا جوتا کون لے گیا۔ اور کسی اور کا جوتا پہن کر باہر نکل آتا۔ چونکہ اُن کا جانا زیادہ تر اچھے علاقوں میں ہوتا تھا جہاں متمول لوگ رہتے تھے۔ اس لیے پٹائی کی انھیں فکر نہ تھی۔ وکی نے اس کام کو اس لیے چُنا تھا کہ اس میں ندرت تھی۔ یہ عام چوروں کا کام نہیں تھا۔ اس میں وہ اسٹائل سے رہ سکتا تھا۔ آمدنی معقول تھی۔ پولیس کا خوف نہیں تھا۔ کام بھی بس دو تین گھنٹے کا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی آرٹسٹک طبیعت کو اس میں تسکین ملتی تھی۔

پپو اس کی انڈر اسٹڈی تھا۔ اُس کو وکی کا اسٹائل بہت پسند تھا۔ ایک طرح سے وہ

اس کا آئیڈیل تھا۔ گریجویٹ وہ بھی تھا۔ مگر وکی کی شخصیت اور اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس کے کام کی صفائی، اعتماد اور وقت ضرورت نئی منصوبہ بندیاں اسے حیران کر دیتی تھیں۔

"یار کالج میں تو تو نے بہت لڑکیوں کو پٹایا ہوگا۔" پپو نے رشک آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے یار مت پوچھ، کالج کے دن یاد آتے ہیں نا تو میں پاگل ہو جاتا ہوں، کیا لائف تھی۔" وکی نے کہا۔ "اور پتہ ہے کالج میں میں نے کیا آئیڈیا کیا تھا؟"

"کیا؟" پپو نے پوچھا۔

"یار میں کالج کی ڈرامہ سوسائٹی کا ممبر بن گیا۔"

"واہ!" پپو نے اس کی ستائش کی۔ "واقعی لڑکیوں سے دوستی کا اس سے بہتر ذریعہ نہیں ہو سکتا۔"

"دو دو مہینے ریہرسل، ہر شام لڑکیوں کے درمیان۔ ڈرامے کے دنوں میں تو اور بھی مزا آتا تھا۔ اتنا ایکسائٹ منٹ رہتا تھا اور ایسے چانس کہ مت پوچھو۔ ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ ایک لڑکی تھی ہمارے ساتھ رنکی۔ بنگالی لڑکی تھی۔ بہت ایڈوانس، باپ وکیل تھا۔ اس کی اپنی گاڑی تھی۔ کالج کے سالانہ فنکشن میں ہمارے ڈرامے کی تیاری چل رہی تھی۔ لیکن اس کے پہلے اس کا ڈانس تھا۔ اس کی ماں اس کا میک اپ خود کرتی تھی۔ اس کا گرو بھی ساتھ تھا۔ میں نے یونہی ڈریسنگ روم میں جھانکا تو وہ چولی ٹھیک کر رہی تھی۔ گرو تو باہر پبلک میں بیٹھا تھا۔ ماں بھی اس وقت نہیں تھی میرے کو دیکھ کر اس پر ذرا بھی ری ایکشن نہیں ہوا نا۔ میرے کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی وکی ذرا یہ چولی کے ہک تو لگا دے، میرے سے لگ نہیں رہے۔ پپو، وہ سال سالا کالج میں پہلا سال تھا میرا۔ نوا نوا معاملہ تھا۔ میرے تو ہاتھ کانپنے لگے۔ آگے بڑھ کے جیسا تیسا میں نے ہک لگا تو دیا، مگر اس کا سفید رس ملائی کے مانند انگ۔ میرے تو کان جلنے لگے۔

"پھر معاملہ کچھ آگے بڑھا؟" پپو نے پوچھا۔

"نہیں یار، وہ سالی بہت پہنچی ہوئی تھی۔ گاڑی بنا تو بات ہی نہیں کرتی تھی بس سانس لیتی تھی تو ہزار نوٹ خرچ ہوتا تھا اس پر۔ وش کرتی تھی اپنے کو یہی بہت تھا۔"

"یعنی کالج میں ایسا کوئی سیریس لفڑا نہیں ہوا۔" پپو نے پوچھا۔

"بس ایک بار، میں تو خود ہی بچتا تھا کہ کوئی گلے نہ پڑ جائے۔ وہ غالب نے کہا ہے نا

کہ بچو شہد کی مکھی بن مصری کی نہیں۔ تو اپنا بھی یہی اصول تھا۔ اور ادھر سالا ایک سے ایک پیسے والے کی لڑکی، بس ٹائم پاس کرنے کو آتی تھی۔ پھر اپنے کو کیا واندہ تھا۔ بس ایک بار میں بہت بُری طرح پھنسا تھا۔

"کمد نام تھا اُس کا۔"

"نام تو سُنا ہوا لگتا ہے۔" پپّو نے کہا۔ "وہ کمد کرپلانی تو نہیں؟ میں جب کالج ایڈمیشن لیا۔ تو وہ ایم اے میں تھی مگر یار واقعی چیز تھی۔"

"ہاں وہی۔" وکی نے کہا۔ "تو کیا ہوا۔ وہ کالج میں نئی نئی آئی تھی۔ جب میں نے اُس کو دیکھا۔ ہمارا ڈائریکٹر دکشت بھی کمال کی نظر رکھتا تھا۔ وہی ڈھونڈ کر لایا تھا اس کو۔ تو نے تو دیکھا تھا نہ اُس کو۔ ایسا لگتا تھا کہ کہیں سے بھی پن چبھو دو تو رس ہی رس نکلے گا۔ تو کیا ہوا کہ انٹر کالیجیٹ ڈرامہ کامپیٹیشن تھا۔ اس کو ایک غریب لڑکی کا رول کرنا تھا۔ وہ گاڑی سے اُتری تو دکشت نے اسے دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ کپڑے ایک دم چکا چک۔ خوبصورت نارنجی شلوار قمیض۔ گُل بُوٹے بنے ہوئے۔ میرا دل تو اُسے دیکھ کر دھک دھک کرنے لگا۔ ڈرامہ شروع ہونے میں بس آدھا گھنٹہ تھا۔ اُس سے دکشت نے کہا تھا کہ ایک میلا شلوار قمیض لے کر آنا۔ وہ بھول گئی۔ دکشت نے مجھ سے کہا۔ یار وکی اسے لے جا، باہر کمپاؤنڈ میں اس کو بول کپڑے ذرا اچھی طرح میلے کر لے۔ تو بھی مدد کر اس کی اب ٹائم ہی کتنا باقی ہے۔"

"تیرے تو مزے آ گئے ہوں گے۔" پپّو نے کہا۔

"ارے یار مت پوچھ۔ میں تو جیتے جی سورگ میں پہنچ گیا۔ اور معلوم ہے کیا کمال ہوا؟" وکی نے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"یار، اُسے جج لوگوں نے انعام بھی اناؤنس کر دیا۔ پتہ نہیں شکل دیکھ کر دیا کیا۔" وکی نے کہا۔ "اپنا نام سُن کر تو وہ مجھے لپٹ گئی۔ مارے خوشی کے۔ اس کے ساتھ میرا چکر بہت دن چلا۔ وہ تو ڈھے پڑی تھی شادی کے لیے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرا بھی دل بہت تھا۔ مگر یار اپنے پاس تھا ہی کیا۔ سالا دو شرٹ پر تو میں نے پورا سال نکالا تھا۔"

"اُس کا باپ ہوٹل وہوٹل ڈال کر دے دیتا۔" پپّو نے کہا۔ "یہ تو بہت اچھا موقع تھا۔"

"یہی بات تو ہے نا یار۔" وکی نے کہا۔ "یقین مان اپنے اوپر آج تک کسی کا ایک پیسے کا احسان نہیں ہے۔ اپنے باپ کا احسان نہیں لیے تو معشوقہ یا اُس کے باپ کا کیوں لیتے۔" اس نے کئی بار اشارہ کی مگر اپنا دل نہیں مانا۔"

"پھر اس کا کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں یار۔" وکی نے کہا۔ "میں تو بی اے کر کے نکل گیا۔ میرے ساتھی تو سب ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ پھر میرا من بھی کالج میں نہیں لگا۔ امتحان پاس کرنا کیا مشکل تھا۔ بس پہلے ہی پرچے میں ذرا مشکل تھی۔ باقی تو میں اتنے سپلیمنٹ جمع کر لیتا تھا۔ جو سوال معلوم تھا کہ آنے ہی والے ہیں، رات میں گھر پر ہی لکھ لیتا تھا۔ باقی کتاب تو پاس ہی رہتی تھی۔ ایک سے ایک ہوشیار آئے مگر وکی کو کوئی پکڑ نہیں سکا۔"

"سانتا کروز آ گیا بڑو۔"

"چلو۔"

پروڈیوسر کا گھر ڈھونڈنے میں دقت نہیں ہوئی۔ سڑک سے اندر گئے تو کئی چھوٹی موٹی گلیاں نظر آئیں۔ دو ایک راہگیروں سے پوچھا۔ اور کچھ دیر میں مکان کے سامنے تھے۔ سیڑھی چڑھتے ہوئے اُنھوں نے چہروں پر سنجیدگی اور ہلکی سی اداسی طاری کر لی۔ اوپر پہنچے تو فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ باہر دو دو تین تین ٹکڑیوں میں آٹھ دس آدمی کھڑے تھے۔ وکی اور پپو بھی اس انداز سے کھڑے ہو گئے کہ دروازہ کھلنے پر اندر نظر جا سکے۔ اس دوران باہر کھڑے لوگوں کے جوتوں کا اُنھوں ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا۔ سچویشن بُری نہیں تھی۔ اور ابھی تو اور لوگ آنے والے تھے۔

دروازہ بند ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جن خاص لوگوں کا انتظار تھا۔ وہ اب تک نہیں آئے تھے۔ یا پھر متوفی کی بیوہ اور گھر کی دوسری عورتوں کا میک اپ مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس بات کا وکی کو خوب تجربہ تھا۔ جب دروازہ کھلتا تو گھر کی عورتیں سوگوار مگر پوری طرح سجی سنوری ہوتیں۔ ساڑھی، بلاؤز کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہوا معلوم ہوتا۔ بالوں کے جگڑے میں بھی ایک بناؤ ہوتا۔ وکی کی جمالیاتی حِس کو اس منظر سے بڑی تسکین ملتی تھی۔ اُسے اپنے کالج کے ڈرامے یاد آ جاتے تھے۔

کچھ دیر بعد دو چار آدمی زینے طے کرتے نظر آئے۔ انھیں دیکھ کر لوگوں نے کانا پھوسی شروع کر دی۔ جس سے انھوں نے اندازہ لگایا کہ نووارد فلمی دنیا کے جانے مانے لوگ ہیں۔ ان میں ایک شخص

دھوتی، کرتا، اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا اور کچھ زیادہ ہی دکھی نظر آرہا تھا۔ وکی نے پپو سے کہا۔ "یہ ضرور اشوک کی اگلی فلم کا فائینسر ہوگا۔ نئے آنے والوں نے آس پاس دیکھے بغیر دروازے تک پہنچ کر اطمینان سے گھنٹی بجائی۔ ملازمہ نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ پھر انھیں پہچان کر پورا دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور دروازہ پھر بند ہوگیا۔

"اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔" وکی نے کہا۔ "تیاریاں مکمل ہیں۔ تم نے دیکھا۔ پروڈیوسر کی لاش ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی ہے۔ سرہانے اگر بتی جل رہی ہے۔"

اکا دکا لوگ آتے ہی جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی۔ اندر سے کچھ لوگ باہر نکلے اور باہر کھڑے لوگوں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ تیاریاں پوری ہوگئی ہیں۔ بس گاڑی کا انتظار ہے۔ کچھ دیر تو انھوں نے مرحوم کے متعلق باتیں کیں کہ وہ کتنا اچھا آدمی تھا۔ اپنے پیچھے کتنا قرض چھوڑ گیا ہے۔ پس ماندگان کے لیے اس نے کیا کچھ چھوڑا ہے۔ پھر حسب معمول وہ فلموں کے تعلق سے گفتگو کرنے لگے کہ کون سی فلمیں سیٹ پر جا رہی ہیں۔ کس کے پاس بہت کام ہے۔ کچھ فلموں کے خوب چلنے کی پیشین گوئی کی۔ کچھ کے فلاپ ہونے کی۔ سوگواری کا تاثر قریب قریب ختم ہی ہوگیا۔ وکی اور پپو بے تعلقی سے سب کی باتیں سنتے رہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ فائنل ایکٹ شروع ہو تو وہ فٹافٹ اپنا کام پورا کر کے اسٹیج سے رخصت ہوں۔

ایک نوجوان بے حد شاندار جوتے پہنے ہوئے تھا۔ پپو کی نظر بار بار ان پر چلی جاتی۔ وکی نے اسے محسوس کر لیا۔

"پیارے، اس کی آس چھوڑ دے۔ اپنے مطلب کا نہیں ہے۔"

"کیوں۔" پپو نے سرگوشی کی۔

"مر جائے گا وہ صدمے سے۔" وکی نے دھیرے سے مگر مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس کا چہرہ دیکھ، قمیض دیکھ۔"

"قمیض تو بہت قیمتی ہے۔" پپو نے کہا۔

"بدھو، ذرا غور سے دیکھ۔" وکی نے کہا۔ "تیرے کو نہیں لگتا کہ کالر درزی سے پلٹایا گیا ہے۔"

پپو نے غور سے دیکھا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

"ان باتوں کو تو ابھی نہیں سمجھ سکتا۔" وکی نے زچ ہو کر کہا۔ "اس کا جوتا ہرگز مت اڑانا

نہیں تو لفڑا ہو جائے گا۔ یہ جوتا اس کو کسی نے باہر سے بھیجا ہے۔ کوئی رشتہ دار یا دوست فارین میں ہوگا۔"

"اتنا سب سوچتے رہے تو دھندہ کیسے ہوگا؟" پپو نے کہا۔

"بیٹا وکی کے ساتھ رہنا ہے تو سوچنا ہی ہوگا۔ یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ تو ایسی سستی بات کرے گا۔ تو اپنے ساتھ نہیں چل سکے گا۔ یہ سمجھ لے۔ کام پولیس کا ہو یا چور کا بُرا ہی ہوتا ہے۔ اس کو آرٹ بنانے میں ہی آدمی کا کمال ہے۔ نہیں تو سالے تیرے اور معمولی چپل مجور میں فرق ہی کیا ہوا؟"

"ساری یار۔" پپو مرعوب ہوگیا۔ وہ وکی کی انہیں باتوں کا دلدادہ تھا۔

اس دھندے میں تو پپو اس لیے آیا تھا کہ کالج سے نکلنے کے بعد پانچ سال چپلیں گھسنے کے باوجود سو روپے کی نوکری بھی اسے نہیں ملی تھی۔ لیکن اب تو اسے بھی دھندے میں لطف آنے لگا تھا اور پھر وکی کے ساتھ کام کرنے میں کچھ اور ہی مزا تھا۔

دروازہ کھلا اور باہر کھڑے لوگ داخل ہوئے تو دروازے پر ہجوم ہوگیا۔ پہلا مرحلہ تو دروازے کے قریب جگہ حاصل کرنا تھا۔ اس میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بیٹھنے کے بعد وکی نے کمرے کا اطمینان سے جائزہ لیا۔ ڈرائنگ روم زیادہ وسیع نہ تھا۔ تپائیاں، ٹیبل وغیرہ غالباً ہٹا دیے گئے تھے لاش بیچ پر رکھی ہوئی تھی۔ اور اس پر سفید کپڑا پڑا ہوا تھا۔ صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ وکی نے ایک دزدیدہ نظر اندر کے کمرے میں ڈالی۔ اس کا خیال غلط نہ تھا۔ مرحوم کی بیوہ سر پر آنچل لیے سفید ساری میں ملبوس نیم وا پردے کے پیچھے اس انداز سے کھڑی تھی کہ اس کا سراپا بہت کچھ نظر آرہا تھا۔ شاید وہ یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ کون کون لوگ آئے ہیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے وکی کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ کافی لوگوں سے واقف تھی کیونکہ جب کسی واقف کار سے اس کی آنکھیں چار ہوتی تو وہ سر کے ہلکے سے خم سے پہچان کا اظہار کرتی۔ عورت روئی ضرور تھی مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ چہرہ خراب نہ ہونے پائے یا پھر لوگوں کی آمد و رفت سے پہلے اس نے میک اپ درست کرلیا تھا۔ ان باتوں کا اندازہ تو وکی نے منٹوں میں کرلیا۔ مگر پتہ نہیں کیوں اس کا چہرہ وکی کو بار بار ڈسٹرب کر رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ فاصلے کی وجہ سے یا دونوں کمروں کی روشنی میں فرق ہونے سے اور اس لیے بھی کہ وہ پردے کے پیچھے تھی۔ ایک بار بھی وہ اس عورت کے چہرے کو ٹھیک سے دیکھ نہ پایا تھا۔

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ پپّو نے اس کا زانو دبایا۔ اس نے ایک غلط انداز نظر پپو پر ڈالی۔ اس نے اشارہ کیا کہ کام ہو گیا ہے۔ اب انہیں موقع دیکھ کر خاموشی سے نکل جانا تھا۔ دکی نے دیکھا کہ وہ نوجوان جو بہت شاندار جوتا پہن کر آیا تھا۔ اُس کی نظریں بار بار دروازے کے قریب پڑے اپنے جوتوں پر چلی جاتی ہیں۔ شاید وہ جان بوجھ کر اس طرح بیٹھا تھا کہ جوتوں پر دھیان رہے۔ چوری کا اندیشہ ہو سکتا ہے اُسے نہ ہو مگر جوتے اتنے بیش قیمت تھے کہ وہ انھیں نظروں سے اوجھل نہیں رکھ سکتا تھا۔

دِکّی نے آنکھ مار کر پپو کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

"واقعی یار!" پپو نے ہونٹوں پر آئی ہنسی کو دباتے ہوئے کہا۔ "اس کا دھیان تو اپنے جوتوں پر ہی ہے۔"

"لفڑا ہو جاتا ابھی۔" دکی نے کہا۔ "اسی لیے میں نے منع کر دیا تھا لیکن یار یہ عورت کا چہرہ پتہ نہیں کیوں مجھے کھٹک رہا ہے۔"

"پٹانا ہے کیا؟" پپّو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں یار، ایسا لگتا ہے کہ میں اس کو کہیں دیکھا ہوں۔"

"لگ تو مجھے بھی رہا ہے۔ اپنے کالج کی کوئی لڑکی ہوگی۔ مگر یار یہ عورتیں شادی کے بعد اتنی بدل جاتی ہیں کہ سالی پہچانی نہیں جاتیں اور اس کا چہرہ بھی ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔" پپّو نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے۔" دِکّی نے کہا۔ "ایک بار چہرہ دیکھوں تو ابھی یاد آجائے۔"

"تو میں نکلتا ہوں۔" پپّو نے کہا۔ "تیرے کو چانس ملے تو بس اسٹاپ پر آجانا۔"

"ٹھیک ہے!"

ارتھی اٹھانے کی تیاریاں شروع ہوئیں تو شاید آخری دیدار کے لیے وہ عورت کمرے میں آئی۔ دکی اسی لمحے کا منتظر تھا۔ سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ ارتھی کے قریب بڑھے۔ اسی ہڑبونگ میں پپو وہاں سے سرک گیا۔ عورت کے چہرے پر ٹھیک سے نظر پڑی تو دکی ششدر رہ گیا۔ یہ تو کمد تھی۔ کمد کرپلانی۔ دُبلے پتلے چھریرے جسم کی جگہ اب اُس کے سامنے ایک بھرپور عورت تھی۔ جس کا جسم فربہ پن کی طرف مائل تھا۔ رخسار بھر گئے تھے۔ رنگ نکھر گیا تھا۔ کمد کا سوگوار چہرہ اُسے اور بھلا لگا۔ دوشیزگی کے دنوں میں چھب اور تھی اور اب کچھ اور۔ الھڑپن کی جگہ وقار نے لے لی تھی۔ شوخی کی جگہ شائستگی نے، اور اس پر جنسی کشش کی فراوانی! دکی ٹھٹک کر اسے دیکھتا

کھڑا رہا۔ ممکن ہے اُس کی نگاہوں کی حدت اس عورت نے محسوس کی ہو۔ کیونکہ پلٹ کر اس نے وکی کو تیکھی نظروں سے تاکا۔ اور لوگ بھی اس کے بے تکے پن سے گھورنے پر بُرا مان کر فہمائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن وکی کو اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ کمد اُسے پہچان کر ٹھٹکی ضرور مگر فوراً لوگوں کی موجودگی کے خیال سے سسکیاں لیتے ہوئے اُس نے ساڑی کا پلو منہ میں ٹھونس لیا اور نظریں ارتھی پر گاڑ دیں۔ ساتھ آئی عورتوں نے اُسے تسلی دی اور سنبھالتے ہوئے اندر کے کمرے میں لے گئیں۔ دہلیز پر پہنچتے ہی کمد نے ایک بار پھر مڑ کر وکی کو دیکھا۔ وکی کو اس کی نگاہوں میں پتہ نہیں کیوں آسودگی جھلکتی نظر آئی۔ جیسے وہ اپنی اداکاری کی داد چاہ رہی ہو۔

وکی اطمینان سے مڑا۔ اور اپنی بوسیدہ چپلوں کے بجائے ایک نیا قیمتی جوتا پیروں میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ زینے کے پاس وہ جوتوں کے فیتے باندھ رہا تھا۔ کہ ملازمہ باہر آئی اور آہستہ سے بولی۔

"آپ کو مالکن نے کل بلایا ہے۔"

"کل ___ کتنے بجے؟"

"شام پانچ بجے۔"

"ٹھیک ہے" وکی نے کہا۔ "میں آجاؤں گا۔"

پپو اُسے دیکھ کر خوش ہوگیا۔

"بہت سالڈ ہاتھ مارا یار تو نے۔" اس نے وکی سے کہا۔ "اس پر نظر تو میری بھی تھی مگر موقع نہ ملا۔ جہاں پر میں بیٹھا تھا۔ وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ لیکن میں تو سمجھا تھا کہ عورت کے چکر میں تو یونہی نکل آئے گا۔"

وکی نے اس کی پھولی ہوئی قمیض سے اندازہ تو کر لیا کہ کئی جوڑے جوتے اس میں ہونے چاہئیں۔ جُوتے اس طرح رکھے گئے تھے کہ کوئی اور یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ قمیض میں کوئی اور چیز رکھی ہے۔

وہ کچھ کہنے جا رہا تھا کہ اُس کی نظر بس اسٹاپ پر کھڑے ایک شخص پر پڑی جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ارے تو۔"

"ارے تو۔"

دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

یہ وجے شرما تھا۔ ان کے کالج کا ساتھی، ایم اے کرکے لیکچرار ہوگیا تھا۔

"تو یہاں کہاں!" وکی نے پوچھا۔

"میں تو یہیں رہتا ہوں یار، اسٹیشن کے پاس۔" وجے نے جواب دیا۔

"کہاں جا رہا ہے۔" وکی نے ایک سوال اور داغ دیا۔

"آج ڈیمانسٹریشن ہے، یونیورسٹی کے باہر، وہیں جا رہا ہوں۔"

"ڈیمانسٹریشن کس لیے!"

"پگار بڑھانے کی خاطر۔" وجے نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور اگر پگار نہ بڑھا تو۔" وکی نے پوچھا۔

"شاید اسٹرائک ہو جائے۔" وجے کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلائے۔

وکی یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ اگر ایسا ہو تو میرے پاس آجانا۔ پتہ نہیں کیوں اس کی دل آزاری کرنے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ وجے شرما اپنے زمانے کا بہت تیز طالب علم تھا اور ہمیشہ فرسٹ کلاس میں پاس ہوتا۔ وکی کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا۔ پہلے تو وہ اسے چور کہہ کر بلایا کرتا تھا، مگر دوستوں کی شکایت پر کہ تم ایک فن کار کی توہین کرتے ہو۔ اُسے نام سے بلانے لگا تھا۔ کالج کے دنوں میں وکی سوچا کرتا تھا کہ یہ شخص کسی روز ہاتھ لگا تو گن گن کر بدلہ لوں گا۔ مگر اس وقت وہ نفرت کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اُسے بس اتنا یاد رہ گیا تھا کہ یہ شخص اُس کے بہترین دنوں کا ساتھی ہے۔ ہاں ایک آسودگی کا احساس ضرور ہوا مگر وہ بھی اُسے اچھا نہیں لگا، کیا کمینہ پن ہے۔ اس نے خود سے کہا۔

ایک بار پھر انھوں نے چار نمبر بس پکڑی اور چور بازار واپس آئے۔ جوتے بیچ کر وہ دلّی دربار پہنچے۔ وہاں شاندار لنچ لے کر انھوں نے ریگل کا رُخ کیا۔ مگر اس دوران وکی کا ذہن کمد میں اُلجھا رہا۔ اس کا بھرپور سراپا بار بار اُس کے ذہن کو کونچتا رہا۔ اسے حاصل کرنے کی تمنّا اس کے دل میں پھر ایک بار جاگ اُٹھی تھی اور وہ اس کی دسترس سے کچھ ایسی دُور بھی نہیں تھی۔

اگلے روز پانچ بجے ایک بار پھر وہ کمد کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ آج دروازہ خود کمد نے کھولا۔ شاید وہ اُس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ آج بھی وہ سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ کلائیاں خالی تھیں اور سینہ بھی۔ اس کی نگاہیں اٹک گئیں۔ کمد کی چمکتی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتے ہی

وہ سمجھ گیا کہ کمد اُداس نہیں۔ سوگوار ہونے کی وہ محض اداکاری کر رہی ہے۔

فلیٹ بالکل خالی تھا۔ کمد نے شاید ملازمہ کو کہیں بھیج دیا تھا۔ فریج سے شربت نکال کر کمد نے اس کے سامنے رکھا اور بسکٹ وغیرہ۔ اس دوران دونوں بالکل خاموش رہے۔ دونوں ہی سوچ رہے تھے کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے۔ کمد کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔ آخر وکی نے پہل کی۔ اور اسی ہڑبڑاہٹ میں وہ بات کہی جو کہنا نہیں چاہتا تھا۔!

"مجھے اشوک کی موت کا افسوس ہوا۔" اس نے کہا۔ مگر کمد کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دیکھ کر رُک گیا۔

"شاید تمہیں اس کا افسوس نہیں۔" اُس کے لبوں سے نکلا۔

کمد کے چہرے پر کوئی رِدِّ عمل مرتب نہیں ہوا۔ نہ تائید، نہ تردید، نہ استعجاب......

"میں نے کچھ غلط کہا؟" وکی اُلجھ گیا۔

"نہیں۔" کمد اسے دیکھ کر مسکرائی۔ "تم بالکل صحیح سمجھے۔ میں دو روز سے محسوس کر رہی ہوں کہ ایک بار پھر میں آزاد ہوں۔"

"اشوک تمہیں پسند نہیں تھا؟"

"ان معنوں میں نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔" اُس نے کہا۔ "جب میں نے اشوک سے شادی کی تھی تو میں بہت خوش تھی کہ ایک فلم پروڈیوسر سے شادی کر رہی ہوں۔ ڈراموں کی وجہ سے مجھے فلم لائن کا بڑا موہ تھا۔"

"کیا اس نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہیں فلموں میں چانس دے گا؟" وکی نے شربت کا گھونٹ لیا۔

"شادی کے وقت تو اُس نے یہی کہا تھا۔" کمد نے اعتراف کیا۔ "لیکن اگر وہ وعدہ نہ بھی کرتا تو میں اس سے شادی کرتی کیونکہ وہ فلموں سے وابستہ تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے دودھ دوہنے والی گائے سمجھتا تھا۔ جس سے بہ آسانی فلموں کے لیے پیسہ مل سکتا ہے اور ٹھاٹ سے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔"

وکی کو اچھا نہیں لگا کہ وہ اشوک کے بارے میں اس طرح گفتگو کریں۔ ابھی کل ہی اسی کمرے سے اس کی ارتھی اٹھی تھی۔ اُس نے گفتگو کا رُخ موڑنے کے ارادے سے اس سے پوچھا۔

"تمہارے بچے نظر نہیں آتے؟"

"نہیں ہیں۔" کمد نے اختصار سے کہا۔ پھر ایک لحظہ رُک کر بولی۔" میں نے ہونے نہیں دیے۔"

"تمہیں پسند نہیں؟"

"خواہش تو بہت تھی۔" کمد نے کہا۔ "لیکن وہ اکثر اس قدر پی کر گھر لوٹتا تھا کہ کسی لائق ہی نہ رہتا تھا۔ پھر مجھے بھی نفرت ہوگئی۔ میں نے سوچا ایسے ذلیل شخص کا بچہ میری کوکھ میں کیوں پلے۔ تم نے شادی کرلی؟"

"نہیں۔" دکی اب کچھ کنفیوز سا ہونے لگا۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"بزنس۔ جوتوں کا کاروبار ہے۔" دکی نے مختصر سا جواب دیا۔

اس روز دکی دو گھنٹے کمد کے پاس بیٹھا رہا۔ گفتگو کا سرا بار بار ٹوٹ جاتا۔ ایک آدھ ادھورا جملہ، کوئی سوال۔ اپنائیت کا احساس بھی تھا مگر درمیان میں شیشے کی ایک ان دیکھی دیوار بھی تھی۔

"اشوک سے تمہیں ذرہ بھر بھی لگاؤ نہیں؟" ایک بار دکی نے پوچھا۔

"بالکل نہیں — اس کی زندگی خراب تھی۔ اور فلمی عورتیں۔ گھریلو، سیدھی سادی عورتوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے وہ صرف بنک سمجھتا تھا جس میں سے وقت ضرورت پیسے نکالے جاسکتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا کہ خودکشی کرلوں مگر صرف اس لیے نہیں کی کہ اس طرح تو وہ تمام جائداد کا وارث ہوجاتا۔ میرے مرنے سے تو وہ بہت خوش ہوتا!"

"تم طلاق بھی تو لے سکتی تھیں!"

"طلاق لے کر بھی کیا ہوتا۔ مجھے تو مردوں سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" دکی نے پوچھا۔

اس نے دکی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ تو تم پر منحصر ہے۔ مگر اب وہ پرانی ناسمجھ کمد نہیں تھی۔ ایک خوددار عورت تھی۔ وہ چاہتی تھی پہل دکی کی طرف سے ہو۔

دکی نے اس کے خوبصورت، گداز، لَودیتے جسم کو حسرت سے دیکھا۔

بس ایک جملے کی بات تھی۔

دکی جانتا تھا کہ وہ گھر بسا کر نہیں رہ سکتا۔ یہ اُس کی فطرت میں ہی نہیں تھا۔ ورنہ شاید وہ بہت پہلے شادی کرچکا ہوتا۔ اب یہ جسم اُسے للچا رہا تھا۔ اور وہ اُسے حاصل کرنے کے لیے بیتاب

تھا۔کم ازکم اس وقت تو وہ ہاں کہہ ہی سکتا تھا اور کمد اُسے یقیناً سیراب کردیتی۔

اس نے کمد کے دہکتے جسم پر نظر ڈالی۔نہیں یہ وہ کمد نہیں جس سے اُس نے کالج میں محبت کی تھی۔یہ تو تیس بتیس سال کی ایک خوبصورت بیوہ ہے۔جو جسم کے بدلے اپنا تحفظ مانگ رہی ہے۔

ایک لمبی سانس لے کر اس نے اپنے پھیپھڑوں کو آکسیجن پہنچائی۔اس جسم کو حاصل کیے بنا وہ نہیں رہ سکتا چاہے سب کچھ داؤ پر لگ جائے۔اس کے ہونٹ ہلے بھی لیکن وہ جملہ۔۔ وہ جملہ اُس کے سینے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

شرمندہ شرمندہ سا وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔کمد کا چہرہ اُتر گیا۔لیکن وہ اب بھی مایوس نہ تھی۔

"پھر کب آؤ گے؟" اُس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" دکی کی آنکھوں کے آگے سائے لہرائے۔

"مگر میں آؤں گا ضرور۔" اس نے دھیمے سے کہا جیسے خود سے کہہ رہا ہو۔"میں آؤں گا۔ضرور آؤں گا۔"

مضمحل قدموں سے وہ باہر آیا۔دکّی تم بہت بے وقوف ہو۔سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُس نے کہا۔"تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔کوئی حق نہیں۔!!

# دِلبرُودِلبر

دلبر بھائی سے ملاقات کے بعد میری زندگی میں کئی دور رس تبدیلیاں ہوئیں۔ اچھے نمبروں کی وجہ سے مجھے کالج میں داخلہ تو مل گیا تھا مگر کالج کی پُر رونق، ہنگامہ پرور زندگی میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں، کہاں جاؤں، کس سے ملوں، کس سے بات کروں، آس پاس امیر یا خوش حال گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں تھے جن کی اپنی گاڑیاں تھیں یا ٹیکیوں میں آتے جاتے۔ مجھ جیسے لڑکے خال خال ہی نظر آتے تھے اور وہ بھی اس صورتِ حال سے منہ چھپانے کے لیے لائبریری میں گھس جاتے تھے۔ مجھے اٹ پٹا سا تو ضرور لگتا تھا مگر لائبریری میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ کالج کی زندگی کے متعلق میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ کالج کی رومان پرور اور کھلی فضا کے متعلق اور وہ زندگی میرے اطراف ہی تھی مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس میں کیسے حصّہ لوں یا اُس کا حصّہ بنوں۔ میری جیب میں اتنے پیسے ہوتے تھے کہ بس سے آجا سکوں۔ اور دوپہر میں کچھ کھا سکوں۔ اس کے بعد بس چائے کے لیے پیسے بچتے تھے۔ کالج میں چائے پی لیتا تو شام کی چائے کا مسئلہ ہو جاتا۔ دوستوں میں بیٹھتا تو من ہی من میں سوچتا رہتا کہ کہیں چائے کے پیسے ادا کرنے کے لیے مجھ سے نہ کہا جائے۔ یہاں آکر میں نے غلطی تو نہیں کی۔ اور بھی کالج تھے جہاں مجھ جیسے بہت طالب علم تھے۔ شاید وہاں میں زیادہ خوش رہتا۔ ٹرم بدلنے کے بعد واقعی میں کالج تبدیل کر لیتا اگر میری ملاقات دلبر بھائی سے نہ ہو جاتی۔

سچ بات تو یہ تھی کہ ایک روز کینٹین میں انہوں نے مجھے خود اپنی میز پر بیٹھنے کا شرف عطا کیا۔ ان کی میز ہمیشہ طالب علموں سے گھری رہتی تھی مگر اس روز شاید سب فٹ بال میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ دلبر بھائی کا کسی لڑکی سے اپائنٹمنٹ تھا اور وہ حسب معمول لنچ کے

بعد سے اپنی مخصوص میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کینٹن میں داخل ہوا تو تمام میزیں خالی ہونے کی وجہ سے میری نظر سیدھے اُن پر پڑی اور اسی وقت انھوں نے مجھے کینٹن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وقت گزاری کی خاطر انھوں نے مجھے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی جو میں نے بخوشی قبول کرلی۔ میں تو ویسے ہی شتر بے مہار کی طرح کالج میں گھومتا رہتا تھا۔ کبھی باہر ریلنگ پر، کبھی کمپاؤنڈ میں، کبھی زینوں پر، کبھی لائبریری میں۔ کچھ رسمی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے میرا ایک مختصر سا انٹرویو لیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں اسی علاقے میں رہتا ہوں جہاں اُن کی رہایش ہے۔ اور اسی اسکول میں پڑھا ہوں۔ جس کے وہ فارغ التحصیل ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

میں بیان نہیں کرسکتا کہ دلبر بھائی کی رفاقت نصیب ہونے کے بعد مجھے کس قدر سکون ملا۔ مجھے گویا اپنی منزل مل گئی۔۔۔ اب میں کلاس سے چھوٹتا تو سیدھے کینٹن کا رُخ کرتا۔ کالج کے تیز طرار لڑکوں اور خوبصورت لڑکیوں سے میری دوستی ہوگئی۔ پیسوں کے معاملے میں انھوں نے ہمیشہ مجھے کور کیا۔ دلبر بھائی نے دو تین زبردست قسم کے خوش حال لڑکے پال رکھے تھے جو ان سے کالج میں لمحہ بھر کے لیے بھی جدا ہونا گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ میں نے خود دلبر بھائی کو کبھی پیسے ادا کرتے نہیں دیکھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا بلکہ دلبر بھائی ان لڑکوں سے پیسے خرچ کرواتے رہتے۔

"ہیمنت، جاؤ ذرا نیلو کو شاپنگ کرواؤ" وہ اپنے مخصوص نرم مگر تحکمانہ لہجے میں ہیمنت شاہ سے کہتے اور وہ خوش خوش اٹھ کھڑا ہوتا کہ مرشد نے اسے نیلو کے ساتھ چند گھڑیاں تنہا بتانے کا شرف عطا کیا ہے جس کا قرض وہ تمام عمر نہیں اُتار سکتا۔

چند مہینوں میں میرا حلیہ بدل گیا۔ سر کے بال جو ملٹری جوانوں کی طرح تھے راک ہڈسن جیسے ہوگئے۔ کپڑوں کی وضع قطع، تراش خراش بدل گئی۔ کلاس کے ساتھی مجھ سے پوچھنے لگے کہ یار تم کپڑے کہاں سلواتے ہو۔ یہ سب دلبر بھائی کا کمال تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ریڈی میڈ قمیص پتلون کہاں اچھے اور سستے ملتے ہیں۔ کون سا ٹیلر انھیں اس خوبصورتی سے ٹھیک ٹھاک کرسکتا ہے کہ چراغ دین کے سلے ہوئے معلوم ہوں۔ جوتوں کی سیل کہاں کدھر لگتی ہے۔ یہ تو خیر پہلا قدم تھا مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ میں اسکول ٹیم سے کرکٹ کھیلتا تھا تو انھوں نے ذاتی دلچسپی لے کر مجھے کالج ٹیم میں شامل کروا دیا۔ افتتاحی بلے باز دو اور بھی تھے مگر

انھوں نے ٹیم کے کیپٹن اور سکریٹری کو زبردست بریانی پارٹی دی اور مجھے پہلے ہی سال کالج سے کھیلنے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔

دلیر بھائی کی سرپرستی سے میں بہت خوش تھا مگر اس کا اندازہ بعد کو ہوا کہ گاڈ فادر کی طرح وہ بھی موقع آنے پر اپنی خدمات کا صلہ وصول کر لیتے ہیں۔ یوں بھی چھوٹے موٹے معاوضوں کی حقیقت کیا تھی، ہم لوگ تو اُن پر جان فدا کرنے کے لیے تیار تھے۔ پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا کالج جائن کرنے کے بعد میں برٹش کاؤنسل اور یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس لائبریریوں کا ممبر بن گیا۔ ہر ہفتے، پندرہ دن میں پانچ چھ کتابیں لے آتا۔ میرے ساتھی موٹی موٹی کتابیں بغل میں دیکھ کر مرعوب ہوتے تو مجھے دوہری خوشی ہوتی۔ افسوس یہ تھا کہ جتنا مجھے پڑھنے کا شوق تھا اتنی ہی بعض کتابیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ لیکن اس بات سے میں کبھی بددل نہیں ہوا۔ یہاں بھی میرا رویہ افتتاحی بلّے باز کا ہی تھا۔ کہ کچھ بھی ہو کریز پر کھڑا رہنا چاہیے۔ جو کتابیں مجھے اہم معلوم ہوتیں اور دل کو لگتیں میں انھیں بار بار پڑھتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ چند دوسری کتابیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا کہ جو کتاب میں پہلے پڑھ چکا اب دوبارہ دیکھوں تو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ اور ایک بار پھر وہ کتاب اپنے نام جاری کروا لیتا۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جو کئی سال بعد سمجھ میں آئیں۔

دلیر بھائی کو میرا یہ شوق بہت پسند آیا۔ مزاجاً وہ بھی بڑا نفیس ذوق رکھتے تھے مگر پڑھنے سے زیادہ انھیں سماعی علم سے دلچسپی تھی۔ بعض اوقات وہ کسی کتاب کے متعلق یا اُس کے موضوع کے متعلق کچھ دریافت کرتے۔ میں جتنا کچھ سمجھ سکا تھا اٹک اٹک کر، کچھ سوچ سوچ کر ان کے گوش گزار کرتا۔ اگر کسی کتاب کی جلد خوبصورت ہوتی یا کتاب قیمتی ہوتی تو وہ مجھ سے عاریتاً لے لیتے۔ وہ کتاب کئی روز تک ان کے ساتھ رہتی۔ کالج میں، کھیل کے میدان میں، کینٹین میں یہاں تک کہ شام کے وقت جو وہ میرین ڈرائیو کے ساحل پر یا اُس کے قریب کسی ہوٹل میں گزارا کرتے تھے۔ مجھے بھی اپنی کتاب ان کے ہاتھوں میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی۔ اگر وہ کتاب میرے لیے ضروری ہوئی تو لائبریرین سے کہہ کر میں تاریخ بڑھوا لیتا۔

ایک دن ہم کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی بات پر میں نے کہا: "سطح سمندر پر جو اضطراب ہے وہ تو گویا دنیاوی کامیابی ہے۔ لیکن سمندر کی تہہ میں جو اضطراب ہے وہ ایک آرٹسٹ ہی محسوس کر سکتا ہے۔"

"یہ کس کا جملہ ہے ؟" دلبر بھائی نے پوچھا۔
"خاکسار کا۔" میں نے کہا۔
انہوں نے کچھ شک کی نگاہ سے مجھے دیکھا۔
"بہت اچھا جملہ ہے۔" دلبر بھائی نے کہا "اسے تو نوٹ کرنا چاہیئے۔"
میں نے دلبر بھائی سے کہا کہ ایسے کئی جملے نہ صرف میرے اپنے بلکہ مشہور ادیبوں اور مفکروں کے میں نے نوٹ کر رکھے ہیں۔
دلبر بھائی بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے نوٹ بک مجھ سے عاریتاً لی اور اسے ایک خوبصورت چرمی جلد کی ڈائری سمیت جس پر سنہری نقش و نگار کھدے ہوئے تھے اور اوراق سفید ولایتی کاغذ کے تھے ایک اور ساتھی محمود کے حوالے کی۔ محمود کی تحریر بڑی اچھی تھی۔ اُس نے مرشد کا کام جان کر میری ساری نوٹ بک چند ہی روز میں ڈائری میں نقل کر کے دلبر بھائی کے حوالے کر دی۔ اور اب ڈائری مستقل دلبر بھائی کے ہاتھوں میں رہنے لگی۔
اس ڈائری کے ساتھ میں نے دلبر بھائی میں ایک نیا جارحانہ انداز دیکھا۔ وہ علمی، ادبی گفتگو سے یوں تو کوسوں دور رہتے تھے مگر اب وہ ایک نئی شان سے کالج میں ابھرے۔ کالج کے سنجیدہ طالب علم بھی ان کے ساتھ دیکھنے جانے لگے۔ کئی بار وہ پروفیسروں سے بھی الجھے اور پروفیسر جو انہیں محض ایک خوش لباس انسان سمجھتے تھے، ان کا احترام کرنے لگے۔ دلبر بھائی کے ساتھ ظاہر ہے کہ ہماری اہمیت بھی بڑھتی چلی گئی۔ ان کی خواہش کے احترام میں میں نے اردو کے مختلف شاعروں کے مشہور اور دل چسپ اشعار کا بھی ایک انتخاب تیار کر کے دیا جسے انھوں نے محمود سے اُس ڈائری میں نقل کروالیا۔
ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا:
"انڈین فلاسفی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟"
ہندستانی فلسفہ سے بھلا دلبر بھائی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا۔
"ایک پیپر ہے میرا، جونیئر میں" میں نے جواب دیا۔
"نوٹس تو ہوں گے تمہارے پاس۔"
میں نے اقرار میں سر ہلا یا۔
"کل لیتے آنا۔"

دلبر بھائی نے جس تندہی سے ہندستانی فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اُس نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔ یہ سانکھیہ فلاسفی کیا ہوتی ہے۔ یوگ مما مہ کا کیا مطلب ہے۔ شنکر اور رامانج میں کیا فرق ہے۔ ویدانت کیا ہے۔ بدھ فلاسفی اور ویدانت میں کیا فرق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت کم وقت میں بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ دلبر بھائی نے اس پر بس نہیں کیا۔ انہوں نے باقاعدہ فلسفہ کی کلاسیں اٹینڈ کرنا شروع کیں۔ فلسفہ کے طالب علموں سے وہ گھنٹوں بحث میں اُلجھے رہتے۔ ہم لوگوں نے اس تبدیلی پر بہت غور کیا مگر کوئی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تو سمجھ میں آتا تھا کہ اس گہرے شغف کے پیچھے کوئی لڑکی ہی ہو سکتی ہے مگر اس کے کچھ آثار نہ تھے یہ ضرور تھا کہ وہ اکثر دوپہر یا شام میں غائب ہو جاتے تھے جو ان کے اب تک کے معمول کے خلاف تھا۔ ہم نے کئی بار دلبر بھائی سے اشاروں کنایوں میں پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئے۔ آخر ایک دن یہ عقدہ یوں کھلا کہ ایک سہ پہر ہم نے انھیں ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ریشم بھون میں داخل ہوتے دیکھا۔ میرے ساتھ کالج کا ایک ساتھی اشوک تھا وہ میرے منع کرنے کے باوجود ان کے پیچھے ہوٹل میں داخل ہوا۔ یہ ہوٹل زیادہ تر گجراتی اور ہندی ادیبوں کے تصرّف میں تھا۔ اس وقت بھی کئی میزیں ان سے گھری ہوئی تھیں۔ دلبر بھائی نے ایک گوشہ سنبھالا اور ہم لوگ بھی مورچہ مارتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ دلبر بھائی ہمیں دیکھ کر بُری طرح چونکے پھر سنبھل کر اس لڑکی سے ہمارا تعارف کروایا۔

لڑکی خوبصورت تھی۔ اونچا قد، جسم معلوم ہوتا تھا اسٹین لیس اسٹیل کا بنا ہوا ہے، مگر غضب کی لچک تھی۔ چہرے کے نقوش سے اندازہ ہوا کہ پونا کے کسی برہمن خاندان کی ہوگی۔ گورا چہرہ جس پر حجابی گلابی کے چھینٹے سے ڈوبتے ابھرتے رہتے تھے۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ باتوں سے بہت تیز معلوم ہوتی تھی۔ دل ہی دل میں ہم نے دلبر بھائی کو داد دی۔ واقعی بہت اونچا ہاتھ مارا تھا انہوں نے اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہے ایم۔ اے فلاسفی میں ٹاپ کیا ہے اور اسی سال کالج میں ملازم ہوئی ہے تو اور بھی حیرت ہوئی۔ دلبر بھائی اتنا اونچا شکار کر سکتے ہیں ہم سوچ نہیں سکتے تھے۔

اگلے روز دلبر بھائی نے ہمیں تنبیہ کی کہ آئندہ ہم ریشم بھون کا رُخ نہ کریں اور نہ کسی سے روما کا ذکر کریں۔ ریشم بھون کا راستہ تو ہم نے چھوڑ دیا مگر پھر جلد ہی دلبر بھائی کو میری ضرورت پڑنے لگی۔ روما کا کالج آفس کامن روم سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اکثر

دفتر کے کلرک بے رخی سے انکار کرتے یا دلبر بھائی سے کہتے کہ کوئی پیغام ہو تو دے دیں۔ ظاہر ہے دلبر بھائی کو بھی خاصی احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ پھر کبھی فون مسلسل انگیج آتا یا بگڑا ہوا ہوتا۔ اس لیے جب وہ کسی بنگالی فلم کے ٹکٹ لے آتے تو روما تک اطلاع پہنچانے کا کام میرے ہی ذمہ ہوتا۔ دلبر بھائی جب آرٹ فلم کی بات کرتے تو ان کا مطلب بنگالی فلم ہی ہوتا تھا۔ اُن دنوں چترا سینما اور لوٹس سینما میں ہر اتوار کی صبح بنگالی فلم دکھائی جاتی تھی۔ ان تھیٹروں پر بڑی چہل پہل رہتی۔ متوسط اور امیر گھرانوں کے لوگ گاڑیوں اور بسوں میں آتے۔ ستیہ جیت رے، رِت وِت گھٹک، مرنال سین وغیرہ کی فلمیں دیکھنے کے لیے۔ ایسی جگہوں پر دیکھا جانا بھی کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ دلبر بھائی شاید روما کے کہنے پر یا کمپنی کی خاطر کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جانے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ انٹرول میں آئس کریم اور بس کا ٹکٹ میرے ذمہ ہوتا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کئی بار روما پیسے ادا کرنے کے لیے پرس کھولتی مگر دلبر بھائی کی پٹھانی حمیت آڑے آجاتی۔ حقیقت یہ تھی کہ روما بڑے مالدار گھرانے کی لڑکی تھی اور تنخواہ کے سارے پیسے شاپنگ اور دوسری چھوٹی موٹی شوق کی چیزوں میں اڑا دیتی تھی۔ دلبر بھائی کو مجھ پر پورا اعتماد تھا یا شاید وہ مجھے اپنے جوڑ کا نہیں سمجھتے تھے۔ بس ایک بات کی انہوں نے مجھے سخت تاکید کر رکھی تھی۔ وہ یہ کہ میں روما کو ہرگز نہ بتاؤں کہ وہ مسلمان ہیں۔ انھوں نے روما کو بتا رکھا تھا کہ ان کا اصل نام ونود چندر ہے۔ گھر والے پیار سے دلبر پکارتے تھے۔ اس لیے وہی نام مقبول ہو گیا۔ اور انھیں پسند بھی ہے۔ وہ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد اردو، فارسی کے زبردست اسکالر تھے۔ کیونکہ پنجاب میں اردو فارسی کا ہمیشہ سے زبردست چلن رہا ہے۔ دلبر بھائی کی یہ احتیاط میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ مجھ سے تو روما یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں مسلمان بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ شاید دلبر بھائی رسک لینا نہیں چاہتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ روما بڑی ذہین تھی اور زبردست اسکالر مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم کے علاوہ دوسرے معاملات میں وہ بالکل خام تھی۔ اکلوتی بیٹی تھی۔ باپ وکیل تھا اور ماں بینک میں افسر۔ روما کے لیے دونوں میں سے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ دلبر بھائی نے پہلی بار اسے مرین ڈرائیو کے کسی ہوٹل میں دیکھا تھا۔ اور دل دے بیٹھے تھے۔ روما شاید اُن کے رکھ رکھاؤ، نفاست، شائستہ اور باوقار انداز سے متاثر ہو گئی تھی۔ اگرچہ بے حد دُبلے تھے، سر پر بال بھی برائے نام تھے جنھیں وہ بڑے اہتمام سے رکھتے تھے مگر ان کے چہرے سے

ہی کچھ بزرگی اور دانشوری کا احساس ہوتا تھا۔ دلبر بھائی نے جتنا کچھ بھی ہندستانی فلسفہ سیکھا ہوگا روما کے غیر تجربہ کار ذہن کو متاثر کرنے کے لیے کافی رہا ہوگا۔

روما اور دلبر بھائی کی شامیں ساتھ ہی گزر رہی تھیں۔ مجھے دلبر بھائی پر بڑا رشک آتا یقین نہیں آتا تھا کہ زندگی اتنی خوش گوار بھی ہو سکتی ہے۔ اپنی ڈائری کے کئی جملے جو میں قریب قریب بھول چکا تھا میں نے روما سے گفتگو کے دوران دلبر بھائی سے سُنے۔ یہ جملے دلبر بھائی کی زبان سے ادا ہوتے تو کچھ اور ہی گہرے معلوم ہوتے۔ ایسا لگتا نہیں تھا کہ یہ جملے میرے سوچے ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ میری ڈائری سے نوٹ کیے ہوئے مختلف مفکروں کے اقوال دہراتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے پیچھے ایک وسیع مطالعہ اور فکر بول رہے ہیں۔ جب وہ ہندستانی فلسفہ پر گفتگو کرتے تو روما منہ کھولے اُن کی باتیں توجہ سے سنتی۔ روما جن اصطلاحات کو معمول کی طرح دہراتی دلبر بھائی کی زبان سے ادا ہوتے تو اُن میں جان پڑ جاتی۔ نشکرم، ویراگ، پراکرتی، رجس، تمس، یوگ، دھیان، آنند ایسے لفظ جب وہ استعمال کرتے تو ایک جہانِ معانی اُن میں آباد نظر آتا۔ عشق کے سوز میں جیسے وہ الفاظ کی رُوح تک پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح جب وہ ستیہ جیت رے اور رت وک گھٹک کا موازنہ کرتے یا کسی فلم پر تبصرہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فلم کو ہم ایک نئے زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔ جو مناظر ہمیں سرسری معلوم ہوتے تھے ان کی گفتگو کے بعد کچھ نئی معنویت اختیار کر لیتے تھے۔ دلبر بھائی سے میں متاثر ضرور تھا لیکن ان کا یہ رُوپ خود میرے لیے بھی حیرت ناک تھا۔ محبت نے شاید ان پر وہ عالم منکشف کر دیے تھے جو محض مطالعہ یا مشاہدہ سے روشن نہیں ہوتے۔

سال بھر گزر گیا۔ ہر آنے والا دن دونوں کو کچھ اور قریب کرتا چلا گیا۔ دلبر بھائی اس بار بے حد سنجیدہ تھے۔ یہ عشق آخر کیا رنگ لائے گا۔ میں سوچنے لگا۔ دلبر بھائی نے اب تک روما کو بتایا نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ وہ کچھ خوف زدہ سے تھے۔ کسی قیمت پر روما کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ محبت میں وہ اس قدر لین ہو چکے تھے کہ ہندو رسم و رواج کے مطابق بھی شادی کے لیے تیار تھے مگر ان کا پٹھان باپ! میں نے ان سے کہا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو مگر کم از کم روما کو اندھیرے میں نہ رکھیں ورنہ اُسے بے حد صدمہ ہوگا۔ کئی بار دلبر بھائی نے ارادہ بھی کیا مگر ان کی ہمت نہ پڑی۔

میرا بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ کچھ سینیارٹی، کچھ تعلقات کی بنا پر میں یونیورسٹی کی

ٹیم کے لیے منتخب ہوگیا۔ مجھے اپنے انتخاب پر بڑی خوشی ہوئی کہ اس طرح میں اپنے دوستوں میں کچھ اور سربلند ہوگیا اور پہلی بار مجھے کئی شہروں کے مفت دورے کا موقع مل رہا تھا۔

میرا کھیل اب ایسا برا نہ تھا۔ یونیورسٹی ٹیم کے لیے میری کارکردگی ٹھیک ہی رہی۔ اب میں دفاعی انداز کا ماہر ہوگیا تھا جس سے کام لینے کی ضرورت کم پڑتی تھی۔ دورے سے واپس آیا تو پتہ چلا کہ دو روز قبل دلبر بھائی کے والد گھر پر آئے تھے۔ ان کی آمد کا مقصد کیا ہو سکتا تھا؟ میرے گھر کا پتہ انھوں نے کیسے حاصل کیا ہوگا۔ کس کس سے پوچھا ہوگا۔ یہ سوالات میرے ذہن میں آئے۔

گھر والوں سے مختصر بات چیت کے بعد میں غسل سے فارغ ہو کر ناشتے پر بیٹھا ہی تھا کہ دلبر بھائی کے والد کے آنے کی اطلاع چھوٹی بہن نے دی۔ میں فوراً اٹھا اور خاں صاحب کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ کمرہ بہت مختصر تھا اور کسی نجی گفتگو کا امکان نہ تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ چائے پلا کر خاں صاحب کو باہر لے جاؤں تاکہ اطمینان سے بات چیت ہو سکے۔ مگر خاں صاحب کا موڈ نہ تھا۔

"یہ چائے وائے رہنے دو، ام بہوت پریشان۔" انھوں نے کہا "تم دلبر کا دوست اے۔ تم کو معلوم دلبر کدھر اے۔"

"دلبر بھائی گھر پر ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ام اس کو دو دن سے تلاش کرتا اے۔"

اس دوران چائے تیار ہو چکی تھی۔ امی نے اصرار کر کے خاں صاحب کو چائے پلائی۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا۔

خاں صاحب نے کندھے پر رکھے جھاڑی رومال کے ایک کونے سے اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ میرے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ اور بغیر کچھ کہے گھر سے باہر نکل گئے

گھر سے نکل کر سب سے پہلے تو میں کالج پہنچا۔ پتہ چلا کہ دلبر بھائی کو گزشتہ پندرہ دن سے کسی نے نہیں دیکھا۔ ہفتے بھر پہلے ایک دوست نے انھیں فاؤنٹن کے کسی ہوٹل میں البتہ دیکھا تھا۔ محمود کو ساتھ لے کر میں ریشم بھون پہنچا۔ ویٹر سے پتہ چلا کہ دو چار دن سے وہ وہاں بھی نہیں آئے۔ ویٹر نے یہ بھی بتایا کہ چار پانچ روز قبل روما کسی بات پر ان پر بہت عفتہ ہو رہی تھی۔ دلبر بھائی سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کے

بھی ہی دونوں نظر نہیں آئے ۔ ہم دونوں نے فاؤنٹن کا ایک ایک ہوٹل دیکھ ڈالا ۔ مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ مجھے اب تشویش سی ہوگئی کہ دلبر بھائی کہیں کچھ۔

آخر میں نے محمود کو رخصت کیا اور روما کے کالج پہنچا ۔ وہاں پتہ چلا کہ روما کالج نہیں آرہی ہے ۔ میں روما کے گھر چلا گیا ۔ روما کے والدین خود حیران و پریشان تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ گزشتہ کئی روز سے روما بہت اپ سیٹ ہے بس روتی رہتی ہے ۔ روما کے گھر تو میں چلا گیا، مگر اس کے والدین سے بات کرتے ہوئے خیال آیا کہ کہیں مجھ سے ملنے سے وہ انکار نہ کردے ۔ دلبر بھائی کے ساتھ میری پوزیشن بھی مشکوک ہوگئی تھی ۔

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی ۔ تین دن سے وہ رو رہی تھی مگر دل تو اب بھی رنج سے بھرا ہوگا ۔ دل کی بات وہ کس سے کہتی ۔ سہیلیوں سے ملنا جلنا تو قریب قریب ختم ہی ہوگیا تھا ۔

"کیسے آنا ہوا ؟" اس نے کچھ انجان بن کر کہا ۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ میں دلبر کی طرف سے کچھ پیغام لے کر آیا ہوں ۔

"دلبر بھائی تین دن سے گھر سے غائب ہیں ۔"

"کیا ؟" وہ کچھ تھرا سی گئی ۔ "تمہیں کیسے معلوم ؟"

"اُن کے فادر میرے گھر آئے تھے ۔" میں نے کہا ۔ "میں فاؤنٹن کے سب ہوٹل، کالج ہر جگہ دیکھ چکا ہوں ۔"

روما کے چہرے پر فکرمندی کے آثار ابھرے اور مٹ گئے ۔ اُس کی جگہ چہرے پر کچھ سختی سی نظر آنے لگی ۔

"تم نے مجھے کبھی بتایا نہیں ؟" اُس نے غصیلی آواز میں کہا ۔

"کیا ؟"

"تم سب ایک ہو ۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑا "بھلا تم کیوں بتاتے ۔"

"میں سمجھا نہیں ۔" میں جان کر انجان بن گیا ۔ "آپ کیا کہنا چاہتی ہیں ؟"

"کیا تم مجھے نہیں بتا سکتے تھے کہ دلبر مسلمان ہے ۔" اُس نے قریباً چیختے ہوئے کہا

"تو آپ کو واقعی معلوم نہیں تھا ؟" میں نے بناوٹی حیرت سے پوچھا ۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ انھوں نے آپ کو بتا دیا ہوگا ۔"

"ہونہہ" روما کی آواز بھرا گئی ۔ "تم لوگوں نے مجھے بے وقوف بنایا ۔ آخر میرے ساتھ

اس مذاق کی تم لوگوں کو کیا ضرورت تھی ۔"

اس نے مجھے بتایا کہ دلبر بھائی اور روما مِیٹرو سینما سے نکل رہے تھے جب اس کی ایک سہیلی شاردا نے انھیں دیکھا۔ شاردا ہمارے کالج کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس نے روما سے پوچھا کہ دلبر سے اس کی دوستی کیسے ہوئی۔ اس طرح دلبر بھائی کا راز فاش ہوگیا۔ اگلے روز روما نے دلبر بھائی کو خوب جھاڑا اور گھر چلی آئی۔ اسے زبردست صدمہ پہنچا تھا جو یقینی تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دلبر بھائی اس کے ساتھ اس طرح فریب کرسکتے ہیں۔

روما پھر رونے لگی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی دلبر بھائی اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور انھیں کھونے کے ڈر سے ہی انھوں نے اسے نہیں بتایا مگر اسے بے حد غصہ اور رنج تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ دلبر کو کبھی معاف نہیں کرسکتی کبھی نہیں۔

آخر میں نے روما سے کہا۔

"روما جی، یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ مگر اس وقت تو سوال یہ ہے کہ وہ ہیں کہاں "

"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں" روما نے کہا۔ "میں اب اس کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی "

"تو میں اب چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اختیار ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں انھوں نے آتم ہتیا نہ کرلی ہو"۔

"نہیں" روما چیخ سی اٹھی۔

میں باہر آگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اب کیا کروں۔ تھکا ہارا گھر لوٹا۔ ابھی جوتے اتارے ہی تھے کہ دلبر بھائی کے والد پھر تشریف لائے۔ میں نے انھیں بتایا کہ دلبر بھائی کی تلاش میں اب تک کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے انہیں تسلّی دی۔

دوپہر میں پھر دلبر بھائی کی تلاش میں نکلا۔ پھر سارے ہوٹل دیکھ ڈالے۔ مرین ڈرائیو کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ مگر لاحاصل۔ تھک ہار کر ساحل پر بیٹھ گیا اور موجوں کو بنتے بکھرتے دیکھنے لگا۔ پیروں کو تھوڑا آرام ملا۔ آگے کا لائحۂ عمل سوچ ہی رہا تھا کہ اشوک، محمود اور کالج کے کئی ساتھی نظر آئے۔

"تم یہاں بیٹھے ہو اور ہم کب سے تمہیں ڈھونڈھ رہے ہیں" اشوک نے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"ارے " محمود نے کہا "تمہیں پتہ نہیں دلبر بھائی تین دن سے گھر نہیں پہنچے۔"

"ہاں یار" میں نے جواب دیا۔ "میں بھی انہی کو تلاش کرنے نکلا ہوں۔ مگر کہیں پتہ نہیں چلا۔"

ایک ناریل والا ہمارے قریب سے گزرا۔ اشوک نے اس سے ناریل کا پانی پلانے کے لیے کہا۔ اس نے سر سے ٹوکرا اُتارا اور ہمارے لیے ناریل چھیلنے لگا۔

ہم لوگ ناریل کا پانی پی رہے تھے کہ سمندر کے اندر دور تک چلی گئی کچی سڑک پر کوئی آدمی بہت دھیمے دھیمے چلتا نظر آیا۔ دور سے اس کی شباہت دلبر بھائی کی طرح ہی تھی۔ ہم سب اُس کی طرف دوڑے۔ اس کی چال ایسی تھی کہ اب گرا کہ تب گرا۔ کپڑے میلے چکٹ ہو رہے تھے۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ نزدیک پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ وہ دلبر بھائی ہی تھے۔

ہم نے انھیں سلام کیا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے شاید ہمیں پہچانا ہی نہیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑا۔

"دلبر بھائی"

میں نے انھیں پکارا مگر ہاتھ پکڑتے ہی احساس ہوا کہ ان کا بدن بخار سے جل رہا ہے۔

ہم انھیں ٹیکسی میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ میں محمود کو دلبر بھائی کے گھر روانہ کیا کہ ان کے والد کو اطلاع دے۔

دلبر بھائی کئی دن حیات و موت کی کش مکش میں رہے۔ اس دوران روما نے کئی بار مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر ملاقات نہ ہوئی۔ کئی روز بعد بخار اُترا۔ دس روز بعد ڈاکٹر نے انھیں گھر لے جانے کی اجازت دی۔ مگر تاکید کی کہ کم از کم مہینہ بھر بستر سے نہ ہلیں۔

بستر پر لیٹے لیٹے وہ ہمہ وقت خلا میں گھورتے رہتے۔ میں نے کئی بار ان سے گفتگو کی کوشش کی مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک روز وہ بستر پر لیٹے حسبِ معمول خلا میں تک رہے تھے اور میں ان کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے بڑی کمزور آواز میں کہا۔

"روما سے ملے تھے۔"

"ہاں" مجھے خوشی ہوئی۔ دس روز میں پہلی بار انہوں نے کچھ کہا تھا۔

"بہت ناراض ہے مجھ سے ؟"

"بہت "

" یار بڑی غلطی ہوئی ۔ سوچ رہا تھا بتا دوں ۔ تم سے کوئی بار گفت گو ہوئی تھی پر ہمت پڑی ۔"

" ایک کام کرو گے ؟" دلبر نے لجاجت سے کہا ۔

دلبر بھائی اور اس طرح لجاجت سے بات کریں ۔ میں کٹ گیا ۔

" کہئے ، میں ضرور کروں گا ۔"

" روبا سے ملو " دلبر بھائی نے کہا " اس سے کہنا مجھے معاف کر دے ۔ جاؤ ابھی جاؤ ۔ اسی وقت ۔"

باہر آیا تو خاں صاحب ساتھ ہو لیے ۔

" بیٹا ام تم سے بہوت کھوش " انھوں نے کہا " آج دلبر کا بائی ( بھائی ) ہوتا تو وہ بھی اس کا اتنا کدمت ( خدمت ) نئیں کرتا جتنا تم کیا ۔"

میں بھلا کیا جواب دیتا ۔

" ادھر آؤ ۔ آج ام تم کو چائے پلائے گا ۔"

میں سعادت مندی سے ان کے ساتھ ہو لیا ۔

ملباری کے ہوٹل میں انہوں نے دو خاص ملائی والی چائے کا آرڈر دیا ۔ اور چائے پیتے ہوئے بولے ۔

" دیکو بچہ ، ہم آج تک تم سے نئیں پوچھا کہ یہ سب کیا معاملہ ہے ۔ ام تمہارے باپ کا مافک ہے ۔ تم سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے ۔"

میں نے سوچا اچھا ہے خاں صاحب کے ردّ عمل کا بھی پتہ چل ہی جائے ۔ میں نے خاں صاحب کو تمام باتیں بتائیں ۔ سوائے اس آخری بات کے جو دلبر بھائی نے کہی تھی ۔ خاں صاحب نے صبر و سکون سے میری پوری بات سُنی پھر کچھ دیر کے لیے تفکر میں غوطہ زن ہو گئے ۔ پھر کہا ۔

" بیٹا اس کا حل کیا ہے ۔ وہ چھوکری کو تم سمجاؤ ( سمجھاؤ ) اتنا اچھا لڑکا اس کو زندگی میں نئیں ملے گا ۔ شریف ، اچھا خاندان کا ، خوش شکل ، تعلیم یافتہ ، تم بتاؤ بچہ ۔ اتنا اچا لڑکا اس کو کہاں ملے گا ۔"

"آپ کی بات درست ہے خاں صاحب" میں نے کہا "مگر اس کا مذہب الگ ہے اس کے والدین برہمن، وہ بھلا کب اجازت دیں گے؟"

خاں ساب سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔

بچہ، تم ٹیک (ٹھیک) بولتا۔ اس کا ماں باپ کہاں پسند کرے گا کہ اس کا بچی غیر مذہب میں شادی بنالے۔ لیکن یہ بچہ اس کا زندگی ام کو جان سے زیادہ عزیز۔ ام تم کو سچ بولتا، یہ بمبئی، اس ذلیل شہر میں ہم صرف اس لئے زندگی گزار دیا کہ ہمارا بچہ پڑھ لکھ لے۔ اس کا زندگی بن جائے۔ تم کوشش کرو۔ ام خدا سے دعا مانگے گا کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو راہ ہدایت نصیب کرے۔ ام سچ بولتا ام اپنا بچے کے آڑے نہیں آئے گا۔ اس کا زندگی ہم کو جان سے زیادہ عزیز۔ تم کوشش کرو کہ دونوں مل جائے۔ جیسا بھی ممکن ہو۔

مجھے خاں صاحب کے جذبۂ پدری پر حیرت ہوئی۔ باپ کی محبت بھی کہیں اس قدر شدید ہوسکتی ہے۔ شاید اپنے بچے کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بالکل ٹوٹ گئے تھے۔

"امارا ایک ہی اولاد" خاں صاحب آبدیدہ ہوگئے۔ "اب آگے جو خدا کا مرضی۔ اس کا مشیت اس کو مالوم۔ ام تو ہار گیا۔ بچہ ام تو ہار گیا۔"

خاں صاحب نے رومال کے گوشے سے آنسو پونچھے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

گھر آیا تو پتہ چلا کہ روما محمود کے ساتھ گھر آکر گئی۔ محمود اور گھر والوں نے اُسے بتا تو دیا تھا کہ دلبر بھائی اب خطرے سے باہر اور رو بصحت ہیں۔ لیکن شاید وہ مجھ سے مل کر اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔ خاں صاحب سے مل کر تو میں اس قدر متاثر ہوا تھا کہ سوچا تھا فوراً روما سے ملوں گا۔ لیکن جب پتہ چلا کہ روما گھر آکر گئی۔ تو پھر روما سے ملنے کو میرا جی نہیں چاہا۔ دلبر بھائی کا وہ لجاجت بھرا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ مجھے جیسے خود پر غصہ آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ شکست دلبر بھائی کی نہ ہو میری اپنی ہو۔ دلبر بھائی کی معافی کی بات اگر میں کہہ دوں تو ان کا امیج جو میری نظروں میں تھا ٹوٹ جائے گا۔ میں دو روز نہ روما سے ملا نہ دلبر بھائی سے۔ تیسرے دن دلبر بھائی سے ملا تو میں نے بہانہ بنایا کہ روما سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دلبر بھائی بہت دھیمے دھیمے رک رک کر گفتگو کر رہے تھے۔ دو جملے کہتے تو ہانپنے لگتے دیر تک خاموش رہتے۔ ایسے ہی خاموشی کے ایک وقفے میں میری نظر دروازے پر پڑی اور روما دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اس کے پیچھے محمود کھڑا ہوا تھا۔ دلبر بھائی اُسے دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ شاید وہ

بھی دلبر بھائی کی اس حالت زار کو دیکھ کر گنگ رہ گئی۔

وہ باہر نکل آیا اور محمود سے بات چیت کرنے لگا۔ بعد میں دلبر بھائی نے بتایا کہ روما شادی کے لیے راضی ہوگئی ہے۔

"تو آپ مذہب تبدیل کر رہے ہیں؟" میں نے اُن سے پوچھا۔

"میں نے تو اس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو اس کے مذہبی طریقے سے بھی شادی کی رسم انجام دینے کے لیے تیار ہوں لیکن وہ سول میرج پر مُصر ہے۔ اسے بس اس بات کا غصہ ہے کہ میں نے اس سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی کہ میں مسلمان ہوں۔"

آج جب میں روما کو نشان پاڑہ کی تنگ گلیوں سے اپنی مخصوص انداز کی نووار کی اراہی ساڑی میں، ماتھے پر بندیا لگائے اعتماد و تمکنت کے ساتھ ساتھ خوش خوش بس اسٹاپ کی طرف بڑھتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ کوئی لڑکی بیڈر روڈ کے پانچ کمروں کے فلیٹ سے نکل کر اس کھولی میں بھی اس قدر خوش رہ سکتی ہے۔ خاں صاحب اور روما میں بڑی اچھی سوجھ بوجھ ہے۔ دلبر بھائی ایک سگریٹ کمپنی میں سیلز آفیسر بن گئے ہیں۔ ان کی شامیں آج بھی مرین ڈرائیو کے کسی ہوٹل میں گزرتی ہیں۔ روما کے والدین شروع میں بہت ناراض ہوئے۔ دو ایک سال بعد غصہ ٹھنڈا ہوا تو دلبر بھائی کو کسی فرم میں ڈائرکٹر بنانا چاہا مگر دلبر بھائی نے منظور نہیں کیا۔ وہ اپنی ملازمت میں خوش ہیں۔ ہندستانی فلسفہ اور بنگالی فلمیں آج بھی انھیں بیحد محبوب ہیں۔ مجھے نہ ہندستانی فلسفہ سے رغبت ہے نہ بنگالی فلموں سے پھر بھی جب کبھی مرین ڈرائیو جانا ہوتا ہے اور کبھی کبھی ہی ہوتا ہے کیونکہ میں خود ایک قومی بنک میں ملازم ہوں۔ اور شادی کے جھمیلوں میں پڑ چکا ہوں میں دلبر بھائی اور روما سے ضرور ملتا ہوں اور ان کی پیچیدہ گفتگو کو خندہ پیشانی سے سُنتا رہتا ہوں۔

# جاڑے

کالونی کے دروازے پر ٹیکسی رُکی اور ایک عورت بڑی تمکنت سے برآمد ہوئی ۔ پیازی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس سیاہ چشمہ لگائے ۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے جو قلفی والے سے محوِ گفتگو تھا، چونک کر اُسے دیکھا ۔ ارے یہ تو رضیہ بیگم ہیں افسر صاحب کی پتنی ، بے اعتنائی سے اُس نے بنڈی سے بیڑی نکالی اور پھر قلفی فروش کی طرف متوجہ ہو گیا ۔

سہ پہر پورے عروج پر تھی ۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے رضیہ کے آویزوں سے اٹھکھیلیاں کرتے گزر رہے تھے ۔ کالونی کے بچے کھیل میں اتنے محو تھے کہ انہوں نے نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا کون جا رہا ہے ۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ایک فاتح کی طرح وہ جیسے ہی کالونی میں داخل ہو گی ہل چل مچ جائے گی ۔ عورتیں کھڑکیوں سے جھانکنے لگیں گی ۔ مگر خالی دریچے ظاہر کر رہے تھے کہ ابھی کسی کو پتہ نہیں ۔ ایک سایہ سا اُس کے چہرے پر آ کر گزر گیا ۔ چشمہ اُتار کر اُس نے پرس میں رکھ لیا ۔ ہر چیز معمول سے کچھ زیادہ ہی شفاف اور رنگ زیادہ گہرے نظر آ رہے تھے ۔

زینے پر ایک گجراتی ملازمہ سے مڈبھیڑ ہوئی ۔

چھٹی چھیر ٹال گیا میم ساب ؟

اس نے مسکرا کر سر ہلایا ۔ ان نوکروں کو ہر بات کا علم ہوتا ہے ۔

"اچھا ہوا" اُس نے بے نیازی سے ایسے سپاٹ لہجے میں کہا ، جیسے کہہ رہی ہو ،

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

فلیٹ کا دروازہ کھول کر داخل ہوئی تو بکھری ہوئی چیزیں، گرد میں اٹا فرش دہائی دیتے نظر آئے ۔ رضیہ کو بڑے زوروں کی بھوک لگی تھی ۔ رضیہ نے ان کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے گیس کا چولھا جلایا اور سالن کی پتیلی چڑھا دی ۔ اچھا ہوا کہ سالن وہ پکا کر گئی تھی ۔ سامنے رکھے شیلف سے اس نے پلیٹ، پیالے اور چمچے نکالے ، کپ بورڈ میں پلاسٹک کے بکس میں ڈبل روٹی

کے سلائس بھی وہ نکالے ، برتنوں کو جب تک کھنگالتی سالن گرم ہو چکا تھا۔ کھانے کے لیے بیٹھی تو گھر کا سُونا پن، سناٹا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس نے آشا بھونسلے کے پھڑکتے، جذبات انگیز گیتوں کا کیسٹ ٹیپ ریکارڈر پر لگا دیا۔ دو چار لقمے لیے ہوں گے کہ پھر خیال آیا یہ ریکارڈر کیا منمن کر رہا ہے، اس نے آواز کا حجم بڑھا دیا۔ اسٹیریو فونک آوازیں دیواروں سے ٹکرا کر دور تک پھیلنے لگیں۔ وہ ہنسی، جیسے افسر سے انتقام لے رہی ہو۔ افسر کے سامنے تو کوئی اونچی آواز میں گفتگو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ وہ غراتا۔ آزادی بھی کیا نعمت ہے۔ میکے میں تھی تو وہ سارا دن ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر اونچی آواز میں بجاتی رہتی تھی۔ جس دن خاموشی رہتی، پڑوسی سمجھ جاتے کہ رضیہ آج گھر پر نہیں۔ افسر نے تو موسیقی سننے کا مزا ہی غارت کر دیا تھا۔ بہر حال اب وہ آزاد ہے۔ جب اس نے خلع کے لیے درخواست دی تھی سب ہی حیران ہوئے تھے۔ والدین، بھائی، بہن سب سمجھانے آئے تھے۔

لیکن افسر گھر چھوڑنے پر کیسے تیار ہو گیا۔ فلیٹ تو بہر حال رضیہ کے ہی نام تھا۔ اس کے چچا نے جہیز میں دیا تھا۔ نیلوفر، اس کی آٹھ سالہ بچی کے لیے بھی اس نے اصرار نہیں کیا تھا۔ خلافِ عادت بڑے نرم لہجے میں اس نے صرف اتنا کہا تھا، رضیہ گھر کو تباہ کر کے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی صورت سے پشیمانی ٹپکتی تھی۔ اس نے کیس واپس لے لیا ہوتا مگر مہینوں میں تو وہ اپنے حوصلوں کو مجتمع کر پائی تھی۔ افسر کی تو سرشت ہی ایسی تھی۔ اس نے جب بھی اس کی طرف دیکھا ایسے دیکھا جیسے کسی حقیر کیڑے کو دیکھ رہا ہو۔ ایسے میں اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے، زمین میں سما جائے یا فضا میں تحلیل ہو جائے کہ افسر کی نظر اس پر نہ پڑے۔ کوئی چیز کبھی اس کی مرضی کے مطابق نہ ہوتی۔ یہ چیز یہاں کیوں پڑی ہے۔ وہ چیز وہاں کیوں رکھی ہے۔ انڈہ تلتے ہوئے اگر زردی ٹوٹ جاتی تو وہ ابل پڑتا، طشتری اٹھا کر پھینک دیتا۔ تمہارے ماں باپ نے تمہیں کچھ سکھایا نہیں۔ پتہ نہیں کس جانوروں کے خاندان سے آگئی ہو۔ کسی نے تمہیں تہذیب نہیں سکھائی۔ اپنے میکے کی برائیاں سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اس کے والدین نے تو اسے کبھی گھڑکا بھی نہ تھا۔ پاپا گھر میں سب سے زیادہ اسی کو چاہتے تھے۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوتی تو بڑے پیار سے سمجھاتے۔ بھائیوں نے ہمیشہ ہتھیلی پر رکھا۔ ایک افسر تھا کہ چہرے پر ہمیشہ خشونت چھائی رہتی۔ اس کی بچی نیلوفر بھی اسے دیکھ کر سکڑ جاتی۔ نیلوفر ہی کیا اسے دیکھ کر کوئی بھی غیر ارادی طور پر سکڑ جاتا تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا تھا۔ وہ اپنے ارادے پر اٹل رہی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آخری موقع ہے

پھر کبھی اس کی ہمت نہ ہوگی اور آج وہ سچ مچ آزاد تھی۔ رضیہ نے ایک لمبی سانس لی اور چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔

ٹیپ ریکارڈر کی بلند آواز سے اس کے سر میں دھمک ہونے لگی تھی۔ عادت جو نہیں رہی تھی۔ ہاتھ دھو کر اس نے بے خیالی میں آواز کم کر دی اور گیلری میں آئی۔ اس کی گیلری کے عین سامنے دوسری گیلری میں جا بجا پنجرے لٹکتے نظر آئے، تعجب ہوا۔ یہاں رہتے ہوئے اتنے سال ہوئے مگر پنجرے کے وجود سے جیسے وہ آج آگاہ ہوئی تھی۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پنجروں کا چلن اس قدر عام ہوگا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سارے پنجرے کھول دیتی۔

تھوڑی دیر گیلری میں کھڑی رہی پھر خیال آیا کہ سارا کام ابھی یونہی پڑا ہے۔ اس نے کپڑے بدلے اور صفائی شروع کی۔ پلنگ کی چادر، تکیے کے غلاف، کھڑکیوں کے پردے نکالے، الماریوں سے دھول جھٹکی۔ ڈریسنگ ٹیبل صاف کرتے ہوئے افسر کی تصویر سامنے آئی۔ ایک لمحے کے لیے اُسے خوف محسوس ہوا۔ اُس کی چبھتی نگاہیں! اُس نے فریم اٹھا کر دراز میں ڈال دیا۔ نیلوفر کے کھلونے جا بجا فرش پر بکھرے پڑے تھے انہیں سمیٹ کر بکس میں رکھا۔ ملازمہ کے آنے میں ابھی وقت تھا۔ فرش پر دھول اتنی تھی کہ اُسے اُلجھن ہونے لگی۔ اس نے خود ہی جلدی جلدی جھاڑو لگائی اور فرش پونچھا، تب کہیں چین پڑا۔

اتنا کام کسی اور روز اگر وہ کرتی تو تھک کر چور ہو جاتی مگر آج وہ خود کو بہت ہلکی پھلکی اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ عورتوں کا ایک میگزین لے کر وہ پلنگ پر دراز ہوگئی۔

چار بجے ملازمہ آئی تو اس نے بھی وہی سوال کیا۔

"بائی، سُنا تم کو طلاق مل گیا۔"

"ہوں ..... " اس نے جواب دیا۔

"تو تم اب اِکلاچ رہے گا ادھر؟"

"ہاں، پر تم آئے گا نا؟"

"ام کیوں نہیں آئے گا بائی۔" وہ ہنسی۔ "ام کو امارے پیسے سے مطلب۔"

نیلوفر اسکول سے لوٹی تو اس نے نیلوفر کے کپڑے بدلے، چائے بنا کر دی۔ ٹوسٹ پر مکھن لگایا خود بھی چائے پی۔ ملازمہ کام ختم کر کے گئی تو حسبِ معمول نیلوفر اور وہ چہل قدمی کے لیے نکلے۔

راستے میں خورشید داراب جی اور مسز پریرا ملیں۔ ایسی ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں

گویا علیحدگی اس نے نہ لی ہو بلکہ افسر نے دی ہو۔ اُسے بڑا غصہ آیا۔ مختصر سے علیک سلیک کے بعد وہ آگے بڑھ گئی۔

پارک میں پہنچی تو کوئی بنچ خالی نہ تھی۔ سوائے ایک بنچ کے۔ اُس پر بھی مسٹر بسواس براجمان تھے۔ ناچار اُن سے بھی گفتگو کرنی پڑی۔

"مسز...... میرا مطلب ہے مس رضیہ،" انہوں نے کہا، "آپ نے اچھا کیا، اس BRUTE سے علیحدہ ہو گئیں۔"

مسٹر بسواس کی بات رضیہ کو پسند نہیں آئی۔ شکایت اُسے تھی، کوئی اور افسر کا ذکر اس طرح کیوں کرے۔

اگلے چند روز بہت اچھے گزرے۔ سب سے پہلے وہ اپنے والدین کے گھر گئی۔ وہ لوگ بہت اُداس تھے مگر اُسے خوش دیکھ کر ان کی افسردگی کچھ کم ہوئی۔ وہ بھی ہنسنے بولنے لگے۔ بھائی بہن بھی آ کر ملے۔ دوپہر کو کھانا کھا کر لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ پانچ بجے ماں نے زبردستی اُٹھایا۔

"سونے کے لیے آئی ہے کیا یہاں؟" ماں نے ہنستے ہوئے فہمائش کی۔

"میں بھی یہاں آتی ہوں تو اسی طرح سو جاتی ہوں،" اس کی بڑی بہن نے کہا، "پتہ نہیں کیا بات ہے میکے میں جیسی گہری نیند آتی ہے ایسی تو اپنے گھر پر بھی نہیں آتی۔"

رات میں سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ برسوں بعد وہ اس طرح یکجا ہوئے تھے۔ دیر تک گپ شپ رہی۔ والدین کے اصرار کے باوجود میکے میں وہ نہیں رُکی۔ گھر کا سارا کام چوپٹ ہو جاتا نیلوفر کا اگلے روز کا اسکول تھا اور اس کی ساری چیزیں گھر پر ہی تھیں۔ چھوٹا بھائی گھر تک پہنچانے آیا۔

ایک ایک کر کے وہ اپنی کئی سہیلیوں سے ملی۔ کئی نئے لباس اُس نے بنوائے، کبھی شاپنگ کو نکل جاتی، کبھی نیلوفر کو لے کر کسی تفریح گاہ پر پہنچ جاتی۔ رانی باغ، پلینیٹریم، سائنس سینٹر سب جگہیں اُس نے نیلوفر کو دکھا ڈالیں، گیتوں اور غزلوں کے کئی نئے کیسٹ خریدے۔ کئی فلمیں دیکھ ڈالیں، دن بھر مصروف رہنے کے باوجود تھکان کا احساس خدا جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ خورشید کے اصرار پر اس نے کلب بھی جانا شروع کر دیا۔ کلب کی ممبر تو وہ تھی ہی، مگر پہلے بس کبھی کبھی کسی خاص تقریب میں افسر کے ہمراہ جاتی تھی۔ شام میں سیر کے لیے وہ پہلے بھی نکلتی تھی مگر اب کچھ اور ہی تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ چار بجے سے وہ بننے سنورنے لگتی، زرد خشک چہرہ ایک بار پھر گلنار ہو گیا۔

صحت پہلے سے بہتر ہوگئی۔ راستہ چلتی تو دوڑنے کو جی چاہتا۔ بات بے بات ہنسی آتی، افسر کا اداس چہرہ اور زخمی نگاہیں بار بار چشمِ تصور میں ابھرتے اور احساسِ آزادی اور فرطِ انبساط کی لہروں میں ڈوب جاتے۔ نیلوفر نے دو ایک بار پوچھا ضرور کہ پاپا کہاں گئے ہیں، مگر وہ بھی افسر کی غیر موجودگی سے خوش نظر آتی تھی کہ اُسے ہمہ وقت تعاقب کرتی تہدیدی نگاہوں سے نجات ملی۔

دن گزرتے گئے۔ احساسِ مسرت کی جگہ اطمینان نے لے لی۔ شب و روز ایک بار پھر معمول پر آئے۔ رضیہ کی زندگی ایک بار پھر گھر، بازار، کلب، نیلوفر کے اسکول اور شام کی سیر تک محدود ہوگئی۔ اُسے اب کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ مگر خالی پن کا کچھ احساس سا ہونے لگا۔ صبح آنکھ کھلتی تو ایک لمبا دشوار دن سامنے نظر آتا۔ ملازمت کی اسے نہ خواہش تھی نہ ضرورت۔ والدین کا دیا اُس کے پاس بہت کچھ تھا، کئی کمپنیوں کے شیئرز تھے۔ جن سے باقاعدہ منافع ملتا رہتا۔ بینک میں طویل میعاد کے لیے رقم جمع تھی جہاں سے ہر مہینے اُس کے جاری کھاتے میں رقم جمع ہوتی رہتی۔

ایک روز رضیہ کلب میں تاش کھیل رہی تھی۔ پاس کی میز پر افسر کا نام سُن کر اس نے کنکھیوں سے دیکھا، پھر کان لگا کر اُن کی گفتگو سننے لگی۔ مسٹر ورما کہہ رہے تھے کہ افسر کا بزنس فیل ہوگیا۔ باوجود اس کے کہ افسر کا اب اس سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ یہ خبر سُن کر اُسے دکھ ہوا۔ ویسے بھی افسر کا خیال کسی نہ کسی حیلے سے اکثر اس کے ذہن میں آتا ہی تھا، مگر اس سے زیادہ دکھ اُسے اس بات سے زیادہ ہوا کہ لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا تعلق رضیہ سے جوڑ دیا۔ کہا جاتا تھا کہ افسر رضیہ سے علیحدگی کے بعد بہت بدل گیا تھا، افسردہ رہتا تھا، کچھ لاپروا بھی ہوگیا تھا۔ کئی لوگوں نے اُسے نیلوفر کے اسکول کے باہر اپنی گاڑی سے نیلوفر کو تکتے دیکھا تھا۔ افسر کے متعلق طرح طرح کی باتیں رضیہ کو معلوم ہوتی گئیں۔ اس نے سوچا لوگ اُسی کو الزام دیتے ہوں گے۔ پہلے بھی جب خلع کے بعد وہ کلب میں موضوعِ گفتگو بنی تھی تو اسے بڑی جھینپ سی محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ لوگ اس سے ہمدردی ظاہر کرتے تھے۔ اب ان کی ہمدردیاں افسر کی طرف منتقل ہو رہی تھیں۔ اُس نے کلب جانا کم کر دیا۔ شاید وہ کلب جانا ترک کر دیتی مگر اتنے سارے لوگوں کے درمیان اُسے اچھا لگتا تھا۔ اس کے علاوہ افسر کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش بھی بڑھ گئی تھی۔ چار پانچ مہینوں کے بعد افسر امریکہ چلا گیا۔ پھر ایک عرصے تک اسے افسر کی کوئی خبر نہیں ملی۔

شاید یہ بھی اتفاق تھا کہ جس شام اس نے افسر کے امریکہ جانے کی خبر سُنی اُس کے اگلے ہی روز صبح جب اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اُس نے اپنا جسم پتھر کی طرح وزنی محسوس کیا۔ دیر تک

وہ بستر سے نہ اُٹھ سکی ۔ اچھا ہی ہوا کہ اس روز اتوار تھا ۔ اگر نیلوفر کا اسکول ہوتا تو بڑی مشکل ہوتی۔ یہ کیفیت کم زیادہ چار پانچ روز رہی پھر خود بخود ختم ہو گئی ۔ اور وہ پہلے کی مانند خود کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگی ۔ خورشید کے کہنے پر اُس نے اب جسم کو تندرست اور پھرتیلا رکھنے کے لیے ورزشیں شروع کیں ۔ خود کو مصروف رکھنے، خوش رہنے کے لیے اس نے دانستہ کوششیں کیں ، اس کا اثر بھی ہوا ۔ چہرے سے زردی تو کب کی جا چکی تھی ۔ ساری کے بجائے اس نے شلوار قمیص کا استعمال بڑھا دیا ۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی کم عمر نظر آنے لگی ۔ خوش لباسی ، متانت اور بھرے بھرے جسم نے اسے ایک نئی پھبن اور وقار عطا کیا ۔ جو بھی دیکھتا متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا ۔ کئی مردوں نے قریب آنے کی کوشش کی ۔ کلب میں پتے کھیلتے ہوئے بارہا اُسے لگا کہ کوئی شخص خواہ مخواہ اس سے سٹا جا رہا ہے ۔ کبھی زبانی ، کبھی نظروں میں کئی پیغام آئے ۔ کسی نے فلم ، کسی نے چائے کی دعوت دی مگر رضیہ سے جب بھی کوئی مخاطب ہوا ، رضیہ کو اس کی آنکھوں میں پنجرے لہراتے نظر آئے ۔ انجانی فضاؤں میں پرواز کرنے کی اُسے نہ خواہش تھی نہ ہمت ۔ انسانی رشتوں پر سے اس کا اعتقاد اُٹھ گیا تھا ۔ اس کی سہیلیوں نے اُسے بہت اُکسایا مگر بقول اُس کے انسانی رشتوں کا حال بھی پتنگ جیسا تھا کہ ادھر فضا میں بلند ہوئی ، کچھ دیر لہرائی ، بل کھائی ، ابھی جی خوش نہیں ہوا کہ ڈور ٹوٹی اور کاغذ اور تیلی کا ڈھیر ہواؤں کے رحم و کرم پر ۔ دیر یا سویر تمام تعلقات کو ختم ہونا ہی ہے ورنہ بوجھ بن جاتے ہیں ۔

ایک صبح وہ نوکرانی کو ٹھیک سے کپڑے دھونے کی ہدایت کر رہی تھی کہ ڈاکیہ خط ڈال گیا ۔ کافی دنوں بعد کوئی خط اس کی دہلیز پر آیا تھا ، اس کا دل دھڑکنے لگا ۔ اُس نے خط اُٹھا کر دیکھا ۔ امریکہ سے آیا تھا ۔ اس کی سہیلی گیتا جھویری کا خط تھا ۔ اُسے ہلکی سی مایوسی ہوئی ، لکھا تھا ۔

پیاری رضیہ

تمہارے شوہر کو یہاں آج ایک دعوت میں دیکھا تو تمہاری یاد بڑی شدت سے ستانے لگی اور میں تمہیں خط لکھنے بیٹھ گئی ۔ اس دعوت میں مجھے پتہ چلا کہ تم نے افسر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے ۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور دُکھ بھی ، تفصیل سے لکھو ، یہ سب کیسے ہوا ، افسر خلافِ توقع بڑی خوش دلی سے ملا ۔ اُس کے ساتھ ثریا وسیم بھی تھی ۔ سنا ہے وہ اکثر اُس کے ساتھ دیکھی جاتی ہے ۔ تم شاید میرے بارے میں جاننے کی خواہش مند ہو گی ۔ میں یہاں بڑے مزے میں ہوں ۔ مسٹر جھویری بھی ٹھیک ہیں ۔ ہمارے دو بچے ہیں جو اسکول جاتے

ہیں ۔ تم خط کا جواب فوراً بھیجو، پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔

تمہاری

گیتا

اتنے دن بعد افسر کے متعلق جان کر اُسے خوشی ہوئی اگرچہ ثریا وسیم کا ذکر اُسے کھٹکا لیکن اب افسر پر اس کا حق ہی کیا تھا۔ پھر بھی اُس کا جی چاہا کہ افسر سے اس کی دوستی نہ بڑھے۔

اس روز وہ سارا دن گھر پر رہی ۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹی تو بدن پھر بھاری بھاری سا لگا۔ نیلوفر اسکول سے لوٹی مگر وہ اُٹھ نہیں پائی۔ نیلوفر سے دیر تک وہ بدن دبواتی رہی، کبھی کھندلاتی رہی مگر بے سود ۔ اس کی طبیعت پھر کئی دن تک یونہی ماندر رہی ۔ اس بار اُس نے ایک خاتون ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ طبی معائنوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو ٹانکوں اور وٹامن کے مسلسل استعمال پر ختم ہوا۔ کبھی تھوڑا فائدہ ہو جاتا، مہینے دو مہینے اچھے گزرتے پھر وہی حال طبیعت کئی کئی دن تک بوجھل رہتی ۔ طبیعت پر ایک بے دلی سی چھائی رہتی ۔ پھر ایک روز اس کی آنکھ کھلتی تو بالکل صحت مند، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ بالآخر ان دوروں کو بھی اس نے معمول سمجھ کر قبول کر لیا۔

وقفے وقفے سے گیتا کے کئی خط آئے ۔ ہر خط میں افسر کا ذکر ہوتا ۔ افسر کس تقریب میں ملا، کس تفریح گاہ میں نظر آیا۔ افسر سے کہاں ملاقات ہوئی۔ اس کا بزنس کیسا چل رہا ہے ۔ ایک خط سے اُسے معلوم ہوا کہ افسر نے ثریا وسیم سے شادی کر لی ۔ اچھا ہی ہوا، اس نے سوچا۔ شاید اب وہ زیادہ خوش ہو۔

ایک روز مسز مرزا اُس کے گھر آئیں ۔ وہ کئی سال لندن میں رہی تھیں، لو میرج کی تھی۔ کسی زمانے میں ان کے بڑے چرچے سنے تھے رضیہ نے ۔ بڑی کامیاب ڈاکٹر تھیں ۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا سب فیشن چھوڑ چھاڑ برقع پہننے لگیں ۔ تبلیغی جماعت کی بڑی سرگرم ممبر بن گئیں۔ ہر جمعرات کو اُن کے مکان پر خواتین کا اجتماع ہوتا ۔ وہ نیلوفر اور رضیہ کو زبردستی ایک اجتماع میں اپنے ساتھ لے گئیں ۔ اس نے لاکھ اُن سے کہا مگر وہ کہاں مانتی تھیں ۔ انہوں نے کہا تم اپنے ساتھ نیلوفر کو کیوں دین سے ناواقف رکھنا چاہتی ہو؟ ویسے بھی یہاں وہاں تمہارا وقت ضائع ہی ہوتا ہے۔ اجتماع میں آ دگی تو کچھ نہ کچھ حاصل ہی ہوگا۔

شروع شروع میں رضیہ کو ان لوگوں کی باتیں عجیب سی لگیں، کچھ اچھا بھی لگا، کچھ خوف

بھی محسوس ہوا ۔ یہ عورتیں جہنم اور قبر کے عذابوں کا ذکر کچھ اس طرح بیان کرتی تھیں گویا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہی ہوں ۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ۔ نماز تو اس نے بچپن میں سیکھی تھی اب پھر باقاعدگی سے پڑھنے لگی ۔ مسز مرزا نے کچھ وظیفے بھی سکھا دیے ۔ اُسے واقعی کچھ سکون سا ملا ۔ ایک انجانی طاقت پر سب کچھ چھوڑ کر جیسے وہ بے فکر ہو گئی ۔ بے دلی کے دورے بھی اب کم ہو گئے ، البتہ دو چار ہفتوں کے بعد مسز مرزا کے گھر اجتماعوں میں جانا اُس نے بند کر دیا ، کیوں کہ عذابِ قبر، پُل صراط ، میدانِ حشر کی ہولناک باتیں سُن سُن کر اُسے خفقان ہونے لگا ۔ نماز وہ ضرور پابندی سے پڑھتی رہی ۔

کلب وہ برابر جاتی رہی مگر صرف سہیلیوں سے ملنے ۔ تاش وہ کبھی کبھار ہی کھیلتی ۔ زیادہ وقت ورانڈے میں شادی شدہ خواتین کے ساتھ گپ شپ میں گزرتا ۔ کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن ، پکوان کی نئی ترکیبیں ، بچوں کی بھولی بھالی شرارتیں ، ان کا محبوب موضوع تھیں ۔
ایک شام وہ کلب میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ کسی نے بتایا افسر کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا ۔ پتہ نہیں کیوں اسے خیال آیا کہ افسر کی موت کی ذمّہ دار وہ خود ہے ۔ گیتا نے افسر کی موت کی خبر اسے کیوں نہ دی ۔ ممکن ہے اس کا خط ابھی راہ میں ہی ہو ۔ گھر پہنچ کر اس نے گیتا کو خط لکھا ۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں ۔ اُسے یقین تھا کہ اُس نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا تھا مگر اُداسی بوند بوند اس کے دل و دماغ ، رگ رگ پر برسنے لگی ۔ جیسے کوئی مسافر کھلے میدان میں ہو اور بوچھار آ جائے ، وہ بھیگتی رہی ۔
رات نیلوفر کو سلا کر شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے لگی تو اس کی نظر اپنی کلائیوں میں جگمگاتی چوڑیوں پر پڑی ۔ اُس نے چوڑیاں اُتار کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیں ۔
بستر پر لیٹی تو خیال آیا کہ علیحدگی کے بعد بھی وہ تمام وقت افسر کے متعلق ہی سوچتی رہی تھی اور اب ......

سوچنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں رہا تھا ۔

# بُلاوا

اُس کی آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا چھا گیا جیسے سورج بدلیوں میں گھر گیا ہو۔ اس نے دیکھا وہ ایک بہت بڑے سوراخ کے دہانے پر کھڑا ہوا ہے اور تمام چیزیں اس سوراخ میں کھنچتی چلی جا رہی ہیں۔ ہرے بھرے درخت فضا میں اُڑتے پرندے، مکانات، بجلی کے قمقمے، موٹریں، گاڑیاں، ڈاک کا ڈبہ، خوش پوش راہ گیر، سڑک پر کھیلتے بچے، سبک اندام حسینائیں، بازار، رکشائیں سب ہی اپنی ملی جلی آوازوں سمیت جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سوراخ سے مسلسل ایک ڈراؤنی سی کھوں کھوں کی آواز آ رہی تھی اور وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا۔ اس کا دل بڑے زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیا۔ اور دیر تک دبائے رکھا، یہاں تک کہ اس کے سامنے پھیلا اندھیرا دھیرے دھیرے چھٹا اور ایک بار پھر تپتی دھوپ اُسے اپنے سر پر محسوس ہوئی۔ وہ سوراخ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ اسے بے حد نقاہت محسوس ہوئی۔ اور بھوک۔ اس کے پیٹ میں خلا سا پیدا ہو گیا۔ برسوں کے مریض کی طرح آہستہ آہستہ چلتا وہ سڑک کے ایک ڈھابے نما ہوٹل تک پہنچا اور لکڑی کی بینچ پر خود کو گرا دیا۔ اس نے ٹیبل والے کو آملیٹ اور ڈبل روٹی کا آرڈر دیا اس کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اگر ٹیبل والا فوراً ہی آرڈر کی تعمیل نہ کرتا تو شاید وہ سو ہی گیا ہوتا۔ مگر آملیٹ اور ڈبل روٹی سامنے دیکھ کر اُس نے خود کو سنبھالا اور چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر حلق سے اُتارنے لگا۔ پہلے چند لقمے وہ بڑی مشکل سے لے سکا۔ مگر دو چار لقمے پیٹ میں گئے تو کچھ جان میں جان آئی۔ آملیٹ ختم کر کے اس نے چائے منگوائی۔ چائے کا گرم گرم سیاہ جوشاندہ حلق سے اترا تو اس کی طبیعت کسی قدر بحال ہوئی۔ وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ جان کر وہ اُٹھا۔ نزدیک ہی ایک مونسپل پارک نظر آ رہا تھا۔ پیسے ادا کر کے وہ اس طرف بڑھ گیا۔

پارک تقریباً خالی تھا۔ ایک جگہ سایہ دیکھ کر وہ لیٹ گیا اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تب اچانک اس کا ذہن اپنے کالج کے نوجوان لیکچرر کی طرف منتقل ہوا جو برسوں قبل کہا کرتا تھا کہ کائنات ایک بہت بڑے سوراخ میں داخل ہو رہی ہے اور عنقریب ہم سب اس میں کھو جائیں گے۔ اس وقت اس کی بات اسے بہت عجیب لگی تھی۔ لوگ اسے سنکی سمجھتے تھے اور اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ حالانکہ وہ بہت ہی ذہین آدمی تھا اور اس کا تعلیمی ریکارڈ غیر معمولی طور پر شاندار تھا۔

"کیا کوئی شخص اس سے باہر بھی آسکتا ہے؟" ایک لڑکی نے کھڑے ہو کر اُس سے سوال کیا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم" لیکچرار نے جواب دیا تھا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک بہت بڑا سوراخ ہمیں نگلنے کا منتظر ہے۔ ہم ہر لحظہ اس کی طرف کھنچتے جا رہے ہیں۔ اندر مجھے صرف اندھیرا نظر آتا ہے۔ اس کے اندر کیا ہے مجھے نہیں معلوم۔ اس سوراخ سے گزر کر ہم کہاں پہنچتے ہیں اور آیا اس سوراخ سے ہم کبھی نکل بھی سکیں گے یا نہیں مجھے نہیں معلوم۔ لیکن ہر شخص اس میں اُترتا جا رہا ہے چاہے اُسے پتہ ہو یا نہ ہو۔"

"یہ سوراخ ہر کسی کو نظر کیوں نہیں آتا؟" اس لڑکی نے پوچھا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید وہ اپنی دنیاوی دلچسپیوں اور کاموں میں اِس قدر اُلجھے رہتے ہیں کہ انھیں اس کی خبر ہی نہیں ہوتی۔"

"آپ اور کیا محسوس کرتے ہیں؟" کسی اور نے سوال کیا تھا۔

"بس یہی کہ مجھے اس سوراخ میں اُترنا ہے۔ اور ہر شے اب میرے لیے بے معنی ہو چکی ہے۔ جب تک میں اس سے نہ گذروں مجھے ناملیت کا احساس ستاتا رہے گا۔"

چند مہینوں بعد وہ لیکچرر گم سم ہو گیا تھا۔ شاید وہ واقعی اس میں اُتر چکا تھا۔ وہ گھنٹوں خاموش، گم سم اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا رہتا۔ پڑھانا اس نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی حالت پر سب ہی کو افسوس ہوا تھا اس لیے اور بھی کہ اس نے کالج ہی کی ایک خوبصورت خوش مزاج لیکچرار سے شادی کی تھی۔ کئی طالب علم اور لیکچرار اس کے گھر گئے، اور گفتگو کی کوشش کی مگر وہ ان کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا جیسے وہ نہ تو انھیں پہچانتا نہ اُن کی گفتگو سمجھتا ہو۔

اور اب برسوں بعد جب وہ ان باتوں کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ مطمئن اور کامیاب گھریلو زندگی گذار رہا تھا اور روز بروز ترقی کی نئی منزلوں پر گام زن تھا اچانک وہ خود اِس

حادثے سے دو چار ہوگیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا کیا وہ سچ ہے یا محض ایک بھیانک خواب۔ لیکن اس کے لیے تو وہ ایک آنکھوں دیکھا واقعہ تھا۔ وہ اسے خواب کیسے مان لیتا؟ وہ بھیانک، ڈراؤنی آواز اب بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔

دو چڑیائیں اچانک پھدکتی ہوئی اس کے قریب آئیں اور اڑ کر قریب کے ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھیں۔ بچوں کا ایک غول شور مچاتا ہوا باغ میں داخل ہوا اور باغ کا سکون درہم برہم ہوگیا۔ گھاس پر چلتی چیونٹیوں کی قطار کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا کہ اس تجزیے سے وہ دوچار کیوں ہوا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ان گنت لوگوں کی طرح وہ بھی اس سے بے خبر گذر جاتا شاید مشیت کچھ اور ہی تھی لیکن مشیت کیا ہوتی ہے؟ اس پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اُسے کیا پتہ تھا کہ ایک دن وہ خود اس سے دو چار ہوگا۔ شاید یہ لیکچرار بتا سکے؟ شاید اب وہ اس تجربے سے گذر چکا ہو۔ باہر آچکا ہو۔ ممکن ہے وہ اس کی مدد کر سکے۔

اب وہ خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ نقاہت کا احساس بھی زائل ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھا، کپڑے جھاڑے اور بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

جب وہ لیکچرار کے مکان پر پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ گھر پر سوائے اُس کی بیوی کے اور کوئی نہ تھا جو اب بھی شاید اسی لگن سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ ہاں ایک بوڑھی خادمہ آنگن میں اونگھتی بیٹھی تھی۔

لیکچرار کی بیوی نے اُسے پہچان لیا کیوں کہ وہ اُسے پڑھا چکی تھی۔

'کیسے آنا ہوا؟' اس نے پوچھا 'اتنے عرصے بعد'۔

'بس یونہی آپ لوگوں سے ملنے'۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

'ان کی طبیعت کیسی ہے ابھی؟' اس نے بستر پر لیٹے لیکچرار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'ویسی ہی' اُس نے جواب دیا۔ 'کوئی فرق نہیں، تم بیٹھو میں چائے بناتی ہوں'۔

وہ کرسی کھینچ کر لیکچرار کے پاس جا بیٹھا۔ لیکچرار نے اُس کی طرف دیکھا تک نہیں جیسے وہ اس کے وجود سے بھی بے خبر ہو۔

"ہلو" — اُس نے کہا۔

لیکن وہ بدستور خلا میں گھورتا رہا۔

'سر' — اُس نے زور سے کہا۔ 'میں نے بھی اُسے دیکھا ہے'۔

لیکچرار نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ شاید اس نے اُسے نہیں پہچانا یا اس کی بات نہیں سمجھی۔

وہ اپنا منھ لیکچرار کے قریب لے گیا اور کافی بلند آواز میں چیخا۔

'میں نے دیکھا ہے، اپنی آنکھوں سے۔' اس نے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ 'آپ نے سچ کہا تھا۔'

لیکچرار اسے ویسی ہی خالی نگاہوں سے تکتا رہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔ لیکن شاید اس کی بات لیکچرر کی بیوی نے سن لی تھی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔

'کیا کہا تم نے؟'

"ہاں مادام، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں نہیں تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو۔" اس کی آواز بھرّا گئی "تم ان باتوں میں مت پڑو۔۔۔ ہرگز بھی نہیں، ابھی تمھارے سامنے عمر پڑی ہے۔"

سورج کی الوداعی کرنیں اب درختوں کی شاخوں پر تھیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ لمحے خاموش باہر تکتا رہا جیسے سوچ رہا ہو۔ پھر اسی کھوئے انداز میں بولا۔

"مجھے افسوس ہے مادام، اب میں واپس نہیں جا سکتا۔ مجھے اس سے گذرنا ہی ہوگا۔ میں اس لیے آیا تھا کہ پوچھوں مشیت کیا ہوتی ہے لیکن ابھی جو باتیں آپ نے مجھ سے کیں اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں اس کا جواب آیا ہے کہ مجھے جانا ہی ہے۔ یہ اب میرا مقدّر ہے۔ شاید یہ ہمیشہ سے میرا مقدّر تھا۔ خوشی سے یا ناخوشی سے لیکن اب میں واپس نہیں ہو سکتا، مجھے اس میں اُترنا ہی ہوگا۔"

درختوں کی پھننگیوں سے الوداعی کرنیں بھی رخصت ہو چکی تھیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ کے علاوہ فضا میں جھینگروں کی چکّی تکّی بھی شامل ہو گئی تھی۔ لیکچرار کی بیوی اُسے پتھریلی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکچرار کی نگاہوں میں شاید ہلکی سی چمک اُبھری ــــ یا یہ میرا واہمہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور چائے کا انتظار کرنے لگا۔

# گل دان کا پھول

منہ اندھیرے ڈالی سے جدا کیا گیا پھول اب داراب جی کے دیوان خانے کی زینت ہے۔ دیوان خانے کے ایک گوشے سے پھول کی خوشبو فرش پر پھیلتی، کمرے کی فضا میں بکھرتی، کمرے میں رکھے قدیم وضع کے فرنیچر سے ٹکراتی، کیلوں میں اٹکی شیر کی خوبصورت کھال کو چومتی داراب جی کے آباء واجداد کے سن رسیدہ چہروں پر سے گذرتی دیواروں سے ٹکرا کر ان کے مسامات میں اترتی ہے۔ کمرے کی بوسیدہ دیواروں میں ایک نامحسوس سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور دیواریں بہت ہی خفیف، تقریباً ناقابل پیمائش حد تک کچھ اور کمزور ہو جاتی ہیں۔

بوڑھے داراب جی ملازم کو روز ہی گلدان میں پھول لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مگر اس معمول سے، جسے کئی دہائیاں قبل ان کے آباء واجداد نے شروع کیا ہے، ان کی آنکھیں اس قدر آشنا ہو چکی ہیں کہ جیسے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتیں۔ ان کی بیگم کو پھولوں سے کوئی دلچسپی نہیں اور کچن میں ناشتہ تیار کرتے ہوئے پھول کی نفیس دھیمی خوشبو کا انھیں احساس نہیں ہوتا۔ شیریں کو پلاسٹک کے پھول پسند ہیں۔ خوشبو بالآخر دیوان خانے سے ملے رستم کے کمرے میں پہنچی ہے، اور اس کی بند پلکوں کو چھوا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول دی ہیں، اور قریب تپائی پر رکھا ہوا اخبار اٹھا کر ٹرانزسٹر چالو کر دیا ہے۔

دن کا اجالا اب کمرے میں پھیل گیا ہے اور کمرے کی اشیاء صاف نظر آتی ہیں۔ ایک کوا کہیں سے اڑتا کھڑکی کی منڈیر پر آ بیٹھا ہے، وہ کبھی آنکھیں مچمچا کر حیرت سے گلدان میں لگے پھول کو دیکھتا ہے، کبھی باہر کھلی فضا میں، اور کائیں کائیں کرنے لگتا ہے۔ اس کی آواز سے پتیاں لرزنے لگتی ہیں اور ان پر پانی کے قطرے چمک اٹھتے ہیں۔ کوا اڑ جاتا ہے، مگر پتیاں دیر تک لرزتی رہتی ہیں۔

خوشبو بار بار فرش پر پھیلتی کمرے کی فضا میں بکھرتی داراب جی کے آبا رو اجداد کے بے جان چہروں پر سے گذرتی دیواروں سے ٹکرا کر اُن کے مسامات میں اُترتی ہے اور واپس ہو جاتی ہے۔ شیریں کالج کے لیے نکلتی ہے اور پھر کچھ دیر بعد رستم اپنے دفتر کو روانہ ہوتا ہے۔ داراب جی محلّے کی لائبریری میں اپنے دوستوں سے گپ شپ کرنے چلے جاتے ہیں اور ان کی بیگم اپنے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ کمرہ اب مکینوں سے خالی ہے اور دن بھر یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

کمرے کی اجنبی فضا میں پھول بدستور بکھیر رہا ہے، کبھی کبھی کوئی پرندہ کھڑکی میں آ بیٹھتا ہے اور حیران نظروں سے گلدان کے پھول کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اس کی آواز سے پھول پنکھڑیاں لرزنے لگتی ہیں اور ان پر پانی کے قطرے چمک اٹھتے ہیں۔

خوشبو دن بھر یوں ہی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹتی رہے گی۔ جب تک پھول مرجھا نہیں جاتا اور اگلے روز گلدان میں ایک نیا پھول ہوگا ـــ اور پھر اگلے روز، اور پھر اگلے روز، شاید کسی دن جب داراب جی دیوار پر آویزاں ہو چکے ہوں گے اور یا جب رستم بھی دیوار کی زینت بن چکا ہوگا، شاید کسی روز ـــ یہ بوسیدہ دیواریں ـــ کہ شکستگی ان کا مقدر ہے۔

# تار

شام میں جب میں دفتر سے لوٹتا ہوں تو اپنی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ان چاروں کو سنگیت کی مشق کرتے دیکھتا ہوں ۔ سنا ہے وہ رات میں کسی نائٹ کلب میں ساز بجاتے ہیں ۔ نائٹ کلب کی نیم تاریک فضا میں ان کی موسیقی کیسی انگیز رقص پر کیا تاثر برپا کرتی ہوگی یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن دن بھر کی تکان کے بعد چائے کی پیالی ان کو سننا میرے لیے ایک ایسا خوش گوار تجربہ ہے جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا ۔ کبھی کبھی جب میں بہت تھکا ہوا ہوتا ہوں تو بستر پر لیٹے لیٹے ان کو سنتا رہتا ہوں ۔ ان کے چہرے تو سامنے نہیں ہوتے لیکن موسیقی کی صدائیں میرے اعصاب کو سہلاتی رہتی ہیں ۔ کبھی کبھی اسی عالم میں میں سو جاتا ہوں ۔ نیند کی اس کیفیت میں یا نیم غنودگی کی کیفیت کہنا بہتر ہوگا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی تیزی سے گرتے جھرنے کے کنارے کھڑا ہوں ، تاریک جنگلوں میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان سے گذر رہا ہوں یا کھلے میدانوں میں دوڑ رہا ہوں ۔ یہ سب موسیقی کا نتیجہ ہو سکتا ہے کیونکہ ویسے میں بڑی گہری نیند سوتا ہوں ۔

ان سازندوں میں دو ادھیڑ عمر کے میلانے جسم کے ہیں ۔ ایک ان سے کچھ کم عمر اور ایک بوڑھا جو بظاہر نحیف و نزار ہے لیکن وائلن بجاتے وقت کافی تندرست دکھائی دیتا ہے ۔ اس وقت ایسا بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ اسے ذرہ بھر بھی طاقت خرچ کرنی پڑ رہی ہو ۔ اور چہرہ بھی بالکل پر سکون ہوتا ہے ۔ موسیقی بجاتے ہوئے وہ کبھی کبھی ایک دوسرے کے مقابلے پر اتر آتے ہیں کچھ دیر بعد جب ان میں سے ایک ساتھ نہیں دے پاتا تو سب ہی ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے ہیں ۔ اپنی کھڑکی سے انہیں اکثر بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے لڑتے جھگڑتے اور روٹھتے منتے دیکھتا ہوں ۔ اس عمر میں ان کی بچوں کی سی یہ حرکتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں ۔

سازندوں میں میری اس دل چسپی کو سب سے پہلے میری کم سن لڑکی نے محسوس کیا، پھر میری بیوی نے اور اب وہ بھی اُن میں دل چسپی لینے لگی ہیں۔ یہ سازندے ہمارے معمول میں کچھ رچ بس سے گئے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی کا ناغہ ہو جائے تو صرف ان کو ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی ان کی کمی کھٹکنے لگتی ہے۔ شاید اس کے لیے کوئی خاص بات نہ ہونے کے باوجود پچھلے چند دنوں سے ہمارے گھر کی فضا میں کچھ خالی پن سا محسوس ہو رہا ہے۔ پچھلے چند دنوں سے بوڑھا وائلن بجانے والا نہیں آرہا ہے۔ دفتر سے آنے کے بعد اس کی غیر موجودگی بہت اکھرتی ہے۔ میں گھر پر بیٹھ نہیں پاتا اور کسی دوست یا رشتہ دار سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ میری لڑکی بھی کئی بار پوچھ چکی ہے کہ وائلن بجانے والا کیوں نہیں آرہا ہے۔

ایک شام جب میں دفتر سے لوٹا تو میری بچی نے مجھے بتایا کہ اس بوڑھے کی جگہ پر ایک نوجوان ان کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، دل کو دھچکا سا لگا۔ میں نے کھڑکی میں جاکر جھانکا واقعی ایک نوجوان ان سازندوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ تو کیا وہ ؟ لیکن ان موسیقاروں کے چہرے پر ایسے کوئی آثار نہیں تھے جن سے میرے اندیشے کی تصدیق ہوتی۔ ایک سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دوسرا بڑے اطمینان سے اپنا ساز درست کر رہا تھا اور تیسرا نوجوان کی کسی بات پر زوروں سے ہنس رہا تھا۔

اس نوجوان لڑکے کا وائلن بجانا مجھے پسند نہیں آیا۔ حالانکہ اس کی تانوں میں توانائی اور حرارت دوڑتی معلوم ہوتی تھی اور وہ ان میں کسی بھی طرح نومشق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں بستر میں لیٹ گیا۔ لیکن لیٹے لیٹے بھی میرے کانوں پر اس کی صدائیں ہتھوڑوں کی طرح برستی رہیں۔ میری بیوی اور بچّی نے بھی اس کے وائلن بجانے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

ایک روز میری بچی نے مجھے اطلاع دی کہ یہ نوجوان اس بوڑھے موسیقار کا لڑکا ہے۔

"ہم چاکلیٹ لینے گئے تھے" لڑکی نے کہا "تب ہم نے لڑکے سے پوچھا، انکل بیمار ہے اور تھوڑے دن بعد جب اچھا ہو جائے گا تو آئے گا۔"

اس خبر کو سن کر ایک بوجھ سا ہمارے سر سے اُتر گیا۔ اور واقعی کچھ روز بعد ہم نے دیکھا کہ بوڑھا وائلن بجانے والا ان کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ اس روز وہ لوگ بہت خوش تھے لیکن ہم بھی ان کی خوشی میں شریک ہیں اس کا انہیں علم نہ تھا۔

اس روز اُنہوں نے بہت اُمنگ سے ساز بجائے دیر تک مشق کی یہاں تک کہ بہت تھک گئے۔ جھٹ پٹے کے ملگجے اندھیرے میں ان کے نقوش دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ موسیقی کی صدائیں فضا میں کچھ ایسی رچ بس گئی تھیں اور ہم ان میں کچھ ایسے کھوگئے تھے کہ لگتا تھا کہ سُروں کے ساتھ ہم کائنات کے عارضی مسافر بھی ڈوبتے اُبھرتے جارہے ہیں۔

# کِرنیں

لڑکی پُرامید نگاہوں سے آئینے میں دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے پر طمانیت ہے۔ شاداب جسم میں گردش کرتا لہو، سیاہ جگمگاتی آنکھیں، گھنے سیاہ بال دمکتا ہوا چہرہ اور بھرا بھرا گداز ذگرم جسم اُسے یقین دلاتے ہیں کہ یہ لمحہ، یہ وقت اُس کا ہے۔ کائنات کی تخلیق اس کے لیے ہوئی ہے۔

دُھوپ میں نہائے بے رنگ و روغن مکانات (جن کے باسی بھی کچھ پُرانے معلوم ہوتے ہیں) تاریک گلی کوچے، حدِ نظر تک پھیلا آسمان، صدیوں پُرانا برگد کا درخت، فضا میں چہچہاتے طیور، اُس کا اپنا نیم تاریک کمرہ، بوسیدہ میز، بے آب وتاب گرد آلود فریم، بے بالش کپ بورڈ، ڈائننگ ٹیبل جس کا سنگِ مرمر چٹخ کر دو حصّوں میں تقسیم ہو چکا، ساگوان کا ڈریسنگ ٹیبل جس کے پُرانے شیشے میں لڑکی اپنا سانولا عکس دیکھ رہی ہے اور اُس کے اوپر آویزاں وال کلاک —— کسی چیز سے لڑکی کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اُنس کا ایک گہرا جذبہ اس کے قلب سے نکل کر جیسے ہر شے پر اپنا مہربان لمس چھوڑ گیا ہے۔ اس لمحے ہر شے اس کے کاسموس کا حصّہ ہے جس کے مرکز میں وہ خود ہے کسی جانے انجانے ڈھنگ سے ہر شے ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہے۔

کال چکر اس وقت اس کے قبضے میں ہے۔ سانولی لڑکی آئینے میں دیکھ کر مسکراتی ہے اور خوشی کی یہ لہر دور تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر دیواروں میں آویزاں وال کلاک چھے بجنے کا اعلان کرتا ہے گھنٹے کی آواز سیلی میلی دیواروں سے ٹکراتی، بازگشت پیدا کرتی، چھت میں لگے بے شمار جالوں کو مرتعش کرتی کمرے کی نیم تاریک فضا میں تحلیل ہونے لگتی ہے۔ صدائیں ختم ہوتی ہیں اور کمرہ ایک بار پھر اپنی سابقہ روش پر آجاتا ہے۔ جس کے متغیر ہونے کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مگر اسی لمحے جب ہم یہ سوچ رہے ہیں سُورج اپنی منزلیں طے

کرتا کھڑکی کے اُوپری سرے پر آپہنچا ہے۔ اور سانولی لڑکی کو میٹھی نگاہوں سے تاک رہا ہے۔ کمرہ جگر جگر کرنے لگا ہے۔ جالوں سے پٹی چھت، بوسیدہ کپ بورڈ، پرانا وال کلاک، دیوار سے لگے گرد آلود فریم سب رنگوں کی چھوٹ سے منقلب ہو گئے ہیں۔ شعاعیں رنگین روشن دانوں سے گزرتی، ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے سے ٹکراتی، لڑکی کے کانوں میں جھولتے خوبصورت آویزوں کو چومتی دیواروں پر نت نئے پیٹرن بناتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں۔

کمرہ اب کسی اور ہی سحر زدہ کائنات کا حصہ ہے۔ لڑکی پریوں کی کہانیوں کی کسی خوبصورت شہزادی کے مانند انگڑائی لے کر اُٹھتی ہے۔ اُس کا خرام گویا رقص ہے۔ انگ انگ متحرک رہا ہے۔ فضا انجانے سروں پر نغمہ خواں ہے۔ لڑکی کے ساتھ ہر شے رقص کرتی معلوم ہوتی ہے اور وقت ٹھرک سا گیا ہے۔ ابھی اس منظر سے ہم پوری طرح لطف اندوز ہوئے نہیں کہ سورج جیسے چونک کر ہوش میں آتا ہے اور گلنار ہو کر دریچے سے سرک جاتا ہے۔

فضا میں دور سیکڑوں پرندے ہوا کے دوش پر تیرتے اپنے آشیاں کو لوٹ رہے ہیں۔ روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ ہوائیں کبھی کبھی درختوں کو چھیڑتی ہیں کبھی پتوں کو چومتی ہیں کبھی دیوار و در کو تھپکتی ہیں کبھی راہوں میں بکھرے خس و خار سے اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ ان کی لمبی لمبی نازک انگلیوں نے لڑکی کے بالوں کو منتشر کر دیا ہے جو اب کھڑکی پر کہنی ٹکائے ہر شے کو اندھیرے میں مدغم ہوتے دیکھ رہی ہے۔

# اکیلی بستیاں

ساحل پر آئے اُسے گھنٹہ بھر سے زائد ہو چکا تھا مگر کامیابی کے کوئی آثار نہ تھے۔ چنے والے سے وہ دو بار مونگ پھلیاں خرید کر پھانک چکی تھی۔ ساحل ناپتے ناپتے اس کے پیر شل ہو چکے تھے۔ ہوا کے سرد جھونکے پیروں میں سوئیوں کی طرح کھُب رہے تھے۔ شاید اسے گھر سے شلوار قمیص پہن کر چلنا چاہیئے تھا۔ لیکن اسے جب بھی پیسوں کی اشد ضرورت ہوتی وہ اسکرٹ بلاوز ہی پہنتی تھی کہ اس لباس میں لوگ اسے یا تو اسکول کی طالبہ سمجھتے یا پھر ایسی لڑکی جس نے کالج میں نیا نیا داخلہ لیا ہو۔ ویسے بھی اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ دسویں کیے اسے تین سال ہی تو ہوئے تھے۔ مختصر قد اور دُبلی پتلی ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی کم سن نظر آتی تھی۔ تجربہ کار نگاہیں البتہ تاڑ جاتی تھیں۔ اور اسی لیے اسے میک اپ اور کپڑوں پر خاص توجہ دینی پڑتی تھی۔ مرین ڈرائیو اور چرچ گیٹ پر لڑکیوں کی تلاش میں گاڑی لے کر آنے والے اپنی پسند اور ناپسند کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ کچھ تو ایسے ہوتے کہ کم سن لڑکیوں کو بہ حالتِ مجبوری ہی قبول کرتے انھیں بھرے بھرے پچھائے والی گدرائے بدن کی عورتیں پسند آتی تھیں مگر ادھیڑ عمر کے لوگ پتہ نہیں کیوں ٹین ایجرز میں زیادہ دل چسپی دکھلاتے تھے۔ سنگیتا کو بھی ایسے ہی گاہک پسند آتے تھے۔ ادھیڑ عمر کے بزنس مین، سرکاری، غیر سرکاری کمپنیوں کے آفیسر، کالج کے لکچرر جن کا برتاؤ بڑا مہذب اور شریفانہ ہوتا۔ خاموشی سے چند مختصر فقروں میں سودا طے کرتے۔ اپنی گاڑی یا ٹیکسی میں کسی غیر معروف مگر نفیس ہوٹل میں لے جاتے۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد اسے ایسی جگہ چھوڑ دیتے جہاں سے اس کا گھر نزدیک ہوتا یا بس آسانی سے مل جاتی۔ طے شدہ معاوضے سے کچھ زیادہ ہی دے جاتے۔ ایسے کئی لوگوں سے اُس کے تعلقات اب کچھ بڑھ گئے تھے۔ مگر یہ شناسائی کاروباری سطح تک ہی محدود رہی۔ یہ وہ لوگ تھے جو شاید اپنی ازدواجی زندگیوں میں مطمئن تھے یا اُس میں خلل پسند

نہیں کرتے تھے۔ بس منہ کا مزا بدلنے یا طویل ازدواجی زندگی کی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے چلے آتے۔

تین سال میں، زندگی کس قدر بدل گئی تھی۔ آج جب وہ گلی سے نکل رہی تھی، کسی نے کہا تھا یار یہ سنگیتا کو کیا ہو گیا۔ اسے تو ہم لوگ بھابھا کا ایٹمک ری ایکٹر کہتے تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ سچ مچ اس کا جسم کبھی تو کہانیوں کی شہزادی کی طرح سو جاتا جو سالہا سال سے کسی ویران محل میں سوئی پڑی ہے اور اس کے ساتھ محل اور اس کے اطراف کی ساری چیزیں سو جاتیں۔ کبھی اچانک بیدار ہوتا اور کسی ایٹمک ری ایکٹر کی طرح توانائیوں کا خزانہ سا اس کے اندر ابلنے لگتا۔ اُس سمے اس کا جی چاہتا کہ جگ کی ہر چیز کو تلپٹ کر دے۔ کبھی خواہ مخواہ ہنستی رہتی۔ کبھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ دھینگا مشتی کرتی، کسی کا منہ چڑا دیتی، کسی کو دیکھتی تو بس دیکھتی رہتی۔ وہ بے چارہ سٹ پٹا جاتا کہ پتہ نہیں اس لڑکی نے کیا دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے کپڑوں پر دزدیدہ نظر ڈالتا یا چہرہ پونچھنے لگتا کہ شاید دھبّہ لگ گیا ہو۔ روی کے ساتھ اُس کی دوستی ایسے ہی ہوئی تھی۔ روی نیا نیا بلساڑ سے آیا تھا اور اس کے گھر کے سامنے کپڑوں کی دکان پر سیلز مین کا کام کر رہا تھا۔ کپڑے ناپتے ناپتے اُس نے بے خیالی میں نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے منہ چڑا کر اُسے انگوٹھا دکھا دیا۔ بے چارے نے بوکھلا کر سر جو جھکایا تو شام تک اس کا سر جھکا ہی رہا۔ شام کو وہ خواہ مخواہ ہی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس کے کاؤنٹر پر جا دھمکی۔ دیر تک تھان پر تھان کھلواتی رہی۔ وہ بے چارہ سعادت مندی سے اسے کپڑے دکھاتا رہا۔ پھر اوہنہ کر کے اس نے اسے انگوٹھا دکھایا۔ اور دکان سے باہر نکل آئی۔ دکان کے سارے سیلز مین ہنس پڑے تھے۔ روی کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا تھا۔ سنگیتا کو بڑا لطف آیا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن دکان پر جانے لگی۔ مذاق کب سنجیدگی میں بدلا، تعلقات کب بڑھے اُسے پتہ بھی نہ چلا۔ اور وہ تنہائیوں میں یکجا ہونے کے مواقع تلاش کرنے لگے۔ دکان کے اوپر ہی دکان مالک شری کانت بھائی کی کھولی تھی جہاں دوپہر میں وہ آرام کرتے تھے۔ باقی سارا وقت یہ کھولی سیلز مینوں کے تصرّف میں رہتی۔ کوئی آرام کرنا چاہتا تو چلا جاتا۔ یا پتے کھیلنے کا موڈ ہوتا اور دھندہ مندہ ہوتا تو سیلز مین اسی کھولی کو کام میں لاتے۔ روی اور سنگیتا بھی اکثر کسی نہ کسی بہانے شامیں یہیں گزارتے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں سمٹے پڑے رہتے۔ روی کے شرمیلے پن اور ناتجربہ کاری نے انھیں اس سے آگے کبھی بڑھنے ہی نہ دیا۔ ایک آدھ بوسہ روی لے بھی لیتا تو دونوں دیر تک لرزتے رہتے۔ ایسی ہی ایک رات

اور وہ نوراتری کی آخری رات تھی۔ گلی میں تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ رہتا ہی تھا۔ کبھی گنیش چترتھی، کبھی دیوالی، کبھی دسہرہ۔ نوراتری کی راتیں تو سنہری راتیں تھیں۔ آٹھ راتیں انھوں نے گیارہ گیارہ بجے تک اسی کھولی میں گزار دی تھیں۔ آج روی نے سوچا تھا کہ سنگیتا کو کم از کم دو بجے تک ضرور روکے گا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے مدغم ہوئے جا رہے تھے۔ روی کہہ رہا تھا کہ اگلے مہینے وہ چھٹی لے کر جائے گا۔ اور اپنی بہن سے کہہ کر ماتا جی اور پتا جی کے ذریعہ شادی کی بات چلائے گا۔ وہ خوش تھا کہ یکش نگری کی ایک سندری سے بیاہ کر رہا تھا۔ یکش نگری شری کانت بھائی کی اصطلاح تھی۔ وہ اپنے ملازموں سے جو سب ان کے گاؤں کے تھے، کہا کرتے تھے کہ دیکھو کاؤنٹر کے اس طرف بلساڑ ہے اور دوسری طرف یکش نگری۔ دھوکا نہ کھانا۔ یہ چمک دمک، ہنسی مذاق، قہقہوں کی آوازیں، یہ جادوئی شکلیں سب دھوکا ہے نظر کا دھوکا۔ یہاں کوئی چیز اصلی نہیں۔ روی کو یہ بات اچھی لگی تھی۔ وہ خود گجراتی کے تصویری رسالہ چندا ماما کا خریدار تھا جس میں ایسی کہانیاں چھپتی رہتی تھیں۔ دکان کے سینئر ملازم کہتے تھے کہ شری کانت بھائی خود زبردست دھوکا اپنی جوانی میں کھا چکے تھے اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ ان کے گاؤں کا کوئی آدمی خراب ہو۔ اب یکش نگری کی ایک حسین کایا اس کی گود میں پڑی تھی اور وہ اس سے بیاہ رچانے والا تھا۔ دونوں خوشی میں مدہوش مستقبل کے شاندار سپنے دیکھ رہے تھے کہ دروازہ کھلا تھا اور شری کانت بھائی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ دونوں بھونچکا ہو کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ شری کانت بھائی انھیں غصّہ سے دیر تک گھورتے رہے اور پھر برس پڑے تھے۔ شرم نہیں آتی تم کو، تمہارے پتا کو میں کیا جواب دوں گا۔ میری ہی ذمہ داری پر انہوں نے تم کو یہاں بھیجا تھا نا۔ کیا اسی لیے؟ یہ لچھن کیا شریف لڑکوں کے ہیں۔ روی گھبرا کر کمرے سے نکل گیا تھا اور پھر شری کانت بھائی نے اسے دیکھا تھا جیسے وہ کوئی بیسوا ہو۔ چھنال۔ آوارہ۔ ہمارے لڑکے کو خراب کرتی ہے۔ محلے میں یہ حرکتیں۔ دھندا کرنے کا ہے تو فارس روڈ پر جا کر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ وہ گھبرا کر کانپنے لگی تھی۔ بلاؤں پولیس کو، ٹھہر جا تیرے باپ کو۔ ابھی بلاتا ہوں اور پولیس کو بھی۔ محلے والوں کو بھی پتہ چلے کہ تو کیا چیز ہے۔ اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ اس کے جسم کا سارا لہو جیسے خشک ہو گیا تھا۔ تب ہی شری کانت بھائی نے دروازہ بند کر کے سانکل لگا دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی ردعمل کا اظہار کرتی۔ اُس سے کہا سالی، چل ابھی سیدھے لیٹ جا نہیں تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اور خود ہی اُس کے

کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے لِٹا دیا تھا۔ وہ تو کچھ سمجھ ہی نہ پائی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مارے ڈر کے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے بعد کئی دن تک اس کا ذہن ماؤف رہا جگ جیسے اُس کے لیے سماپت ہو چکا تھا۔ اس کا سارا غصّہ رَوی پر اترا تھا۔ روی نے کئی بار اس سے مل کر معافی چاہنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شری کانت بھائی کا ڈرامہ سمجھ گیا تھا۔ مگر ان کے سامنے اُس کی کیا چل سکتی تھی۔ پھر گاؤں میں اس کے بوڑھے ماں باپ تھے۔ دکان چھوڑ دیتا تو جاتا کہاں اور کیا کرتا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اور کیا تجربہ۔ سنگیتا کا تو سارا سوابھیمان ہی ٹوٹ گیا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنی سہیلی مینا کو ساری بپتا سُنائی تو اس نے ہنس کر اس سے کہا پگلی یہی تو ایڈونچر کے دن ہیں۔ اس نے چرچ گیٹ اسٹیشن کے باہر کار والوں سے لفٹ لینے کا طریقہ بتلایا تھا اور وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شام میں یہ لڑکیاں جو دفتروں، کالجوں سے چھوٹتی ہیں گھر جانے کے لیے لفٹ لیتی ہوں گی۔ اور وہ واقعی مینا کے ساتھ اسٹیشن کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ کیا یہ واقعی ایڈونچر تھا یا وہ اپنے جسم سے انتقام لے رہی تھی۔ شاید اسے وہ خود کھندل ڈالنا چاہتی تھی۔ شروع میں اسے واقعی کچھ نیا پن لگا تھا۔ کیسے کیسے لوگوں سے وہ ملی۔ کبھی کسی شاندار بنگلے پر کبھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔ دو بار وہ مہا بلیشور اور ماتھیران بھی ہو آئی تھی۔ لیکن ایک اندیشہ ہمیشہ اس کے ساتھ لگا رہا۔ وہ کیا کر رہی ہے۔ شاید وہ کسی دلدل میں پھنستی چلی جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اس دَل دَل سے نکل آئے گی، لیکن جس دن اُس نے یہ سوچا اسی رات اس کے کمزور، سدا کے بیمار پتا جی نے پران تیاگ دیے اور اُن کی پنشن آدھی رہ گئی۔ ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اس نے خود کو وہیں کھڑا ہوا پایا۔ ایڈونچر اب ضرورت بن چکا تھا۔ سال بھر سے وہ مرین ڈرائیو پر آنے لگی تھی۔ کیونکہ محلّے کے کئی لڑکوں نے اسے چرچ گیٹ اسٹیشن کے پاس دیکھا تھا اور اُسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

چھک سے بتیاں جلیں اور ساحل پر یہاں سے وہاں تک روشن لکیریں دوڑ گئیں۔ مرین ڈرائیو کے سینے پر کوئنس نیکلس جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ ابھی چھ ہی بجے تھے۔ سورج ڈوبنے میں وقت تھا۔ مگر بادلوں نے سورج کا اتنا زبردست گھیراؤ کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شام کب کی ہو چکی۔ بتیوں کے روشن ہونے سے ساحل پر ہلکی سی رونق آئی، سنگیتا کے بھاری، بوجھل دل میں مسرت کی ایک ہلکی سی لہر دوڑی اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئی۔

وقت گزاری کی خاطر وہ کاروں کی سرخ بتیوں کو تکنے لگی جو نٹ کھٹ بچوں کی طرح لہراتی کاوے لیتی دوڑ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اس سے بھی دل اچاٹ ہو گیا۔ ادھر فضا میں ٹھنڈ کا احساس بھی بڑھ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا اگست کا آخری دن بھی بالآخر ڈوب چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سنگیتا کی ہمت نے بھی جواب دے دیا۔ کچھ دوسری ضرورتیں بھی دہائی دینے لگی تھیں۔ بارش اور ٹھنڈ کی وجہ سے ساحل ویسے ہی ٹھنڈا ر پڑا تھا جیسے لوگ شہر خالی کر گئے ہوں۔ پورے ساحل پر بس دو عرب منڈیر پر بیٹھے بولپلے منہ سے گنڈیریاں چبا رہے تھے۔ ذرا ایک شخص چھتری لگائے پتھروں پر بیٹھا تھا اور کیکڑے پکڑ رہا تھا۔ سامنے ہوٹل سے ایک معمر پارسی جوڑا اپنے کتے سمیت برآمد ہوا اور ایک پچاس سال پرانی تاریخی کار کی طرف بڑھ گیا۔

سنگیتا نے سڑک پار کی اور ہوٹل بامبے لی میں پڑاؤ ڈالا۔ چند جانی پہچانی مسکراہٹوں کے تبادلے ہوئے ہوٹل کا اسٹاف اُسے دیکھ کر شاید خوش ہی ہوا کیونکہ خالی بھائیں بھائیں کرتا ہوٹل بھی کچھ ویران سا معلوم ہو رہا تھا۔ بیرے ایک گوشہ سنبھالے غپ شپ میں مگن تھے۔ کاؤنٹر پر منیجر شام کا اخبار سامنے رکھ کر اونگھ رہا تھا۔ اُسے بیٹھتے دیکھ کر ایک بیرا آیا اور کافی کا آرڈر لے کر گیا تو غائب ہی ہو گیا اور اُس وقت نظر آیا جب ٹھنڈ سے اس کا جسم قلفی ہو رہا تھا۔ کافی پی کر جان میں جان آئی۔ اس دوران وہ ہوٹل کے عقبی حصے میں ہو آئی تاکہ کپڑے ویڑے درست کر لے۔ خود کو ٹھیک ٹھاک کر کے وہ دوبارہ میز پر آئی تو اس نے خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

کافی پی کر وہ گھنٹہ بھر بیٹھی رہی۔ اس دوران کئی میزیں بھریں اور خالی ہوئیں۔ آس پاس کی عمارتوں کے کئی بچے آئس کریم خریدنے آئے۔ ان امیر بچوں کی عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں، ورنہ اس ٹھنڈ میں کس کا دماغ خراب ہوا ہے کہ آئس کریم کا شوق کرے۔ اس کے قریب کی میز پر بیٹھی بے ہنگم جسم کی عورت نے فریج میں رکھا تھمس اپ منگوایا۔ اس میں بھی ویٹر سے کہہ کر برف علیحدہ سے ڈلوایا۔ لوگوں کی آمد و رفت سے بے کیفی کا احساس تو کم ہو گیا۔ لیکن اس کے مطلب کا ایک شخص بھی نظر نہ آیا۔ بوندا باندی پھر شروع ہو گئی تھی۔ کئی دن کی جھڑی کے بعد آج موسم ذرا دیر کے لیے کھلا تھا تو وہ نکل سکی تھی۔ اگر دوبارہ جھڑی لگی تو وہ گھر کیسے پہنچ سکے گی۔ عام دنوں میں تو وہ نو تک گھر پہنچ جاتی تھی۔ پھر ماں کی طبیعت بھی

خراب تھی۔ ماں کا خیال آیا تو وہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔ پھر گھر کے آرام دہ ماحول کے خیال نے اُسے اور مضطرب کر دیا۔ دھندے کے تو کچھ آثار تھے نہیں۔ شاید آج کا دن ہی خراب ہے۔ اُس نے سوچا اور کافی کے پیسے میز پر رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

چھتری کھول کر وہ جیسے ہی باہر آئی ہوٹل کے شیڈ سے کوئی شخص اُس کی طرف لپکا سنگیتا کی آنکھوں میں چمک آئی اور معدوم ہو گئی۔ وہ شخص اُس کے مطلب کا نہ تھا۔

"معاف کیجئے" اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا شاید اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ "میرا گھر یہیں نزدیک ہی ہے۔ اگر آپ -" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "اگر آپ مجھے اپنی چھتری ہیں -" اُس کی ہمّت پھر جواب دے گئی۔

وہ بالکل شمی کپور کے لہجے میں بول رہا تھا۔ کپڑوں کی وضع قطع، بالوں کا اسٹائل بھی مگر چہرے پر بچوں جیسا بھولپن تھا۔

"ساری -" سنگیتا نے کہا "میری چھتری اتنی چھوٹی ہے۔ میرا اپنا بچاؤ ہی مشکل ہے۔ پھر بھلا دو آدمی اس میں کیسے سما سکتے ہیں۔

وہ جھینپ گیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا۔" اُس نے کہا۔

سنگیتا نے کہہ تو دیا پھر اُسے خیال آیا کہ اس کا لہجہ کچھ زیادہ ہی سرد تھا۔ مایوسی یا موسم کے کارن۔ کیا حرج ہے اگر اس شخص کا مکان نزدیک ہی ہو۔

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ سنگیتا نے نوٹ کیا۔ اس کی ہنسی بالکل بچوں کے مانند تھی۔ بچپن اور پختگی جیسے گلے مل رہے تھے۔ بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو چکے تھے۔ سیاہ بالوں میں جگہ جگہ سفیدی جھانک رہی تھی۔ مگر چہرہ گول مٹول بھرا بھرا، گھر کے لاڈلے بچے جیسا کہ ابھی چاکلیٹ کی فرمائش کرے گا۔ شمی کپور کی ہلکی سی شباہت کبھی رہی ہو گی۔ مگر ذہنی نشو و نما یقیناً بچپن اور بلوغت کے درمیان کہیں ٹھہر گئی تھی۔

باہر آتے ہی صحیح رُخ پر چھتری کرتے ہوئے چہرے پر پانی کی بوچھار پڑ رہی گئی۔ اپنے ہم قدم کو بچانے میں وہ تقریباً شرابور ہو گئی۔ بارش کے چھینٹوں نے اُسے کپکپا دیا اور اس کا اضمحلال یک لخت ختم ہو گیا۔ سڑک پر لگے زرد قمقموں کے اطراف بوندیں قطار در قطار موتیوں کی سفید لڑیوں کی شکل میں گرتی نظر آ رہی تھیں۔

مکان واقعی نزدیک تھا۔ پہلے منزلے کی کھڑکی سے ایک بوڑھی عورت جھانک رہی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی اُس نے پلٹ کر کسی سے گجراتی میں کہا کہ سریش آگیا ہے۔

' تھینک یو' راہداری میں پہنچتے ہی اُس نے کہا۔

" آپ اگر پسند کریں تو ایک کپ چائے ہمارے ساتھ بی لیں، سردی کا احساس کچھ کم ہو جائے گا۔" اُس نے کہا۔

اُس کی جھجک شاید دُور ہو چکی تھی۔ سنگیتا شکریے کے ساتھ انکار کرنے جارہی تھی کہ وہی بوڑھی عورت جو آپ تولیہ لیے نیچے آگئی تھی بولی: ہاں، ہاں، آیئے نا، آپ فریش ہو جائیں گی۔ تب تک شاید بارش بھی رُک جائے۔"

بڑھیا نے وہیں تولیے سے سریش کا سر پونچھنا شروع کر دیا۔ سریش جھینپ گیا۔ اُس نے تولیہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زینے طے کرتے ہوئے خود ہی سر پونچھنے لگا۔ بڑھیا اور سنگیتا اس کے پیچھے پیچھے ساتھ ہی اوپر چڑھے۔ دروازے پر ملازمہ قمیض لیے کھڑی تھی۔ وہ قمیض لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو بڑھیا لیے برآمد ہوئی اور اُس نے سویٹر بھی جسم پر چڑھا لیا۔ کمرے میں ایک بوڑھا شخص دھوتی لپیٹے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ہاتھ سے نمسکار کرتے ہوئے بولا: "معاف کیجئے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔"

" نہیں، اس میں تکلیف کیسی؟" سنگیتا نے کہا۔

" زیادہ بھیگے تو نہیں، بوڑھے نے سریش سے کہا۔" چھتری لے کر نکلنا تھا۔"

" میں سمجھا تھا بارش تھم چکی ہے۔ اب نہیں ہوگی۔"

سریش نے سب سے اس کا تعارف کروایا۔ سنگیتا نے خود ہی اپنا نام بتایا۔ اپنے بارش میں پھنس جانے کی داستان اس نے بڑی امنگ سے سُنائی۔ جیسے کوئی ہیرو اپنے سنکٹ میں پھنس جانے کا قصّہ بیان کر رہا ہو۔ سب نے اُس کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سُنا اور درمیان میں ریمارک پاس کرتے رہے شاید اچانک اسے خیال آیا کہ اُس نے سنگیتا سے چائے پلانے کا وعدہ کیا ہے۔

" نارائن کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

" نارائن شاید اس کے ملازم کا نام تھا۔"

"وہ تمہاری تلاش میں گیا ہے۔" بڑھیا نے کہا۔ "کیا کام ہے اُس سے۔"

"ذرا کافی بنوانی تھی۔" سریش نے کہا۔

"روپا سے کہہ دیتے۔" بوڑھے نے کہا۔

"وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔" بڑھیا نے جواب دیا۔

ابھی وہ یہ کہہ رہی تھی کہ ایک خوبصورت پستہ قد گڑیا سی عورت دروازے پر نمودار ہوئی یہ ضرور ان کی بہو ہے۔ انکلیشور کی ہوگی اس کے خوبصورت نقوش کو دیکھ کر سنگیتا نے سوچا۔ اُس کے چہرے سے بیزاری مترشح تھی۔

"کھانا کب سے تیار ہے۔" اس نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کہاں جاکر بیٹھ گئے؟"

تو ایسا کرتے ہیں۔ پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔" سریش کے والد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ کس مصیبت میں پھنسی۔ سنگیتا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس طرح خود کو کسی پر لادنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ارے آپ کھائے بغیر کیسے جا سکتی ہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"معاف کیجئے۔ میری ماں کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ میری منتظر ہوگی۔"

"آپ فکر نہ کریں، میں خود اپنی گاڑی میں آپ کو چھوڑ آؤں گا اور آپ کی ماں کو بھی دیکھ لوں گا۔"

"آپ ڈاکٹر ہیں؟" سنگیتا نے حیرت سے کہا۔

"آپ ڈاکٹر مہتہ کو نہیں جانتیں؟" سریش نے تعجب سے کہا۔ جیسے اُسے یقین ہو کہ کوئی شخص اس کے والد سے واقف نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

ڈاکٹر مہتہ مُسکرائے۔

کھانا پروسا گیا تو اُس نے دیکھا کہ دو تین طرح کی سبزیاں میز پر چُنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ چٹنی۔ اچار۔ کئی قابوں میں گھی میں تر چاولوں سے مٹر اور گاجر کے خوش رنگ ٹکڑے جھانک رہے تھے۔ گرم گرم بھاپ اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو بھوک جاگ اٹھی۔

یہ بھی خوب رہی ۔ مان نہ مان ، میں تیرا مہمان ۔ اُس نے سوچا ۔ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ اسے بھی بڑا لطف آرہا تھا ۔ اسے اپنے بچپن کے دن یاد آئے جب وہ اپنے ماتا پتا اور رشتہ داروں کے ساتھ اسی طرح کھانے پر بیٹھا کرتی تھی ۔ گھر کا ماحول بھی سادہ اور تصنع سے دور تھا ۔ بہت دنوں بعد اُسے یہ محبت نصیب ہوئی تھی ۔ وہ تو ہوسناک یا پھر تضحیک آمیز نظروں کی عادی ہو چکی تھی ۔ روی سے اُس کی شادی ہوئی ہوتی تو آج وہ بھی اسی طرح پُرسکون ، محفوظ زندگی گزار رہی ہوتی ۔

"آپ اتنی بارش میں اکیلے کیسے نکل پڑیں ؟"

بڑھیا کے سوال نے اسے گڑبڑا دیا ۔

"یہ کیا بات ہوئی ۔" ڈاکٹر مہتہ نے کہا ۔ "آدمی گھر پر بیٹھے بیٹھے بور بھی تو ہو جاتا ہے ۔"

"کہاں رہتی ہیں آپ ؟" روپا نے پوچھا ۔

"گرگام ، تارواڑی ۔"

"وہ تو نزدیک ہی ہے ۔"

ڈاکٹر مہتہ نے اس کی ماں کے متعلق دریافت کیا ۔ تفصیلات معلوم کرنے کے بعد انھوں نے نارائن کو ہدایت کی کہ فلاں فلاں دوائیں اور انجکشن بیگ میں رکھ لے ۔

سنگیتا بڑی خفت محسوس کر رہی تھی ۔

"آپ خوامخواہ اتنا کشٹ کر رہے ہیں ۔" اُس نے کہا ۔

"کشٹ کی کیا بات ہے ۔" ڈاکٹر مہتہ نے کہا ۔ "گھر میں پڑے پڑے میں بھی اوب گیا ہوں ۔ اس بہانے ذرا باہر تو نکلنا ہوگا ۔"

سریش بہت خوش ہوا ۔ اس نے سنگیتا کو دیکھا پھر اپنے پتا پر فخریہ نظر ڈالی ۔

"پتاجی میں چلوں ۔" اس نے کہا ۔

"تمہارے سونے کا وقت ہو گیا ۔" ڈاکٹر مہتہ نے کہا ۔ "ویسے بھی تم بھیگ کر آئے ہو ۔"

"ہاں ہاں تم مت جاؤ ۔" سریش کی ماں نے کہا ۔ "تمہارے لیے اوولٹین بنا دیتی ہوں ۔ گرم دودھ پی کر سو جاؤ ۔"

سریش نے سعادت مندی سے سر جھکا لیا ۔

اُس کے بعد کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوئی ۔ بس وہ بار بار سریش کی رکابی میں کچھ ڈال

دیتے۔ اس سے کھانے کے لیے اصرار کرتے۔ کبھی وہ سچ مچ اٹھلاجاتا۔ معلوم ہوتا تھا سارا گھر سریش کے گرد رقص کررہا ہے۔ اُس کی بیوی اس لاڈ پیار سے کچھ بیزار سی لگتی تھی۔

"کملیش کہاں ہے؟" اچانک سریش کو یاد آیا۔

"سوگیا ہے۔" اس کی بیوی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اُس نے بھوجن کیایا نہیں۔"

"ہاں کرلیا" اُس نے مُنہ بناتے ہوئے سر جھٹک کر کہا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو ڈاکٹر مہتہ کی گفتگو سے اُسے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر مہتہ بہت کامیاب ڈاکٹر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بہت دولت کمائی۔ اب وہ خود ہی اُکتا گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ اُن کا لڑکا سریش کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ملازمت کی ضرورت اسے نہیں تھی۔ مگر وہ کچھ بن بھی نہیں پایا تھا۔ اب ان کی ساری توقعات اپنے پوتے سے وابستہ تھیں۔ انہوں نے اپنی پریکٹس پہلے سے بہت کم کردی تھی۔ سنگیتا کو یہ سارے لوگ بہت اچھے لگے۔ اُن پر جیسے وقت کا کوئی اثر نہ تھا۔ محفوظ، آسودہ یہ چھوٹا سا گھر کانچ کا مرتبان تھا جس میں سرسبز پودے باہر کی دست برد سے محفوظ اپنی عمر طبعی بتا رہے تھے۔ کاش اُسے بھی کوئی اسی طرح کسی شیشے کے مرتبان میں رکھ دیتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

اور لیٹین پی کر سریش اُسے نمستے کہہ کر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ اُس کے جانے کے دس منٹ بعد روپا بھی اُٹھ گئی۔ سنگیتا نے ڈاکٹر مہتہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں، چلو،" ڈاکٹر مہتہ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولے۔

گاڑی میں سنگیتا کو خیال آیا کہ ڈاکٹر مہتہ سے غالباً وہ پہلے کبھی مل چکی ہے۔ اُس نے ذہن پر بہت زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ اپنی کثیف سوچ پر وہ خود ہی شرمندہ ہوگئی۔

گھر کے سامنے گاڑی رکی تو لوگوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ گاڑی سے باہر آئی اور نارائن اور ڈاکٹر مہتہ کا انتظار کرنے لگی جو گاڑی کے شیشے چڑھا رہے تھے۔ کنکھیوں سے اُس نے دیکھا۔ روی نشے میں دھت فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اس کے کپڑے کیچڑ میں سنے ہیں۔ تین چار لڑکے اُسے گھیرے ہوئے ہیں اور اُس کا

مذاق اُڑا رہے ہیں ۔

شاید سنگیتا کو دیکھ کر کسی نے اس سے کہا :

"ارے بدھو، یہ بکش نگری ہے ۔سب پیسے کی مایا ہے ۔ تو کیوں اپنی لائف خراب کرتا ہے ۔"

سنگیتا کی ماں واقعی اس کی راہ دیکھ رہی تھی ۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر متعجب ہوئی ۔ ڈاکٹر مہتہ نے خوب اچھی طرح معائنہ کیا ۔ کچھ دوائیں اپنے پاس سے دیں ۔ دوایک دوائیں سنگیتا کو باہر سے منگوانے کے لیے لکھ کر دیں ۔ اس دوران سنگیتا نے ماں کو ڈاکٹر اور ان کے خاندان سے ملاقات کی تفصیل سنائی ۔۔ ۔اس کی ماں بہت خوش ہوئی ۔

رخصت ہوتے ہوئے ڈاکٹر مہتہ نے اُس کی ماں کو تسلّی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے ۔ اُن کے منع کرنے کے باوجود سنگیتا گاڑی تک انھیں چھوڑنے گئی ۔ ڈاکٹر مہتہ نے اُس سے کہا کہ وہ فکر نہ کرے اور ان کے پاس سے باقاعدگی سے دوائیں لے جایا کرے ۔ روی اب تک نشے میں دھت فٹ پاتھ پر پڑا تھا ۔ اُسے اپنی سُدھ نہ تھی ۔ واپس لوٹی تو دواؤں کی شیشیوں کے درمیان اے سوسو کے دو نوٹ چمکتے نظر آئے ۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی ۔

# عمارت

مَیں اس عمارت میں چیک بھنانے کے لیے گیا تھا۔

چیک ڈاک سے آیا تھا۔ پتہ نہیں کس نے بھیجا تھا۔ کسی کے دستخط اس پر ضرور تھے لیکن میں اس شخص سے واقف نہ تھا۔ چیک خاصی بڑی رقم کا تھا۔

چیک پانے کے بعد میں اُلجھن میں پڑ گیا تھا کہ کس نے بھیجا ہوگا، کیوں بھیجا ہوگا۔ بھیجنے والے کا مقصد کیا رہا ہوگا۔ کہیں غلطی سے تو مجھے نہیں بھیج دیا گیا۔

میں نے لفافے پر درج پتے کو بار بار پڑھا تھا۔ پتہ تو میرا ہی تھا۔ چیک پر درج نام بھی میرا تھا۔ پھر میں نے سوچا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے بھلے ہی کسی نے بھیجا ہو، میرے دلدّر تو دور ہو ہی جائیں گے۔ اپنی تاریک کوٹھری سے جس میں دن کو بھی بتی جلانی پڑتی تھی نکل سکوں گا اور اس افلاس زدہ، غلیظ ماحول سے بھی جہاں نالیوں، گڑھوں پر بھی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ بچے صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسکول جائیں گے۔ بیوی کلف کی گئی بنگالی ساڑھی میں دروازے پر استقبال کرے گی تو طبیعت کیسی خوش ہوگی۔

اگلے روز ٹھیک وقت پر میں اس پتے پر پہنچ گیا جہاں پہنچنے کی چیک سے منسلک خط میں ہدایت کی گئی تھی۔

یہ علاقہ ابھی نیا ڈیولپ ہوا تھا۔ چند سال قبل سمندر کا کنارہ پاٹ کر بنایا گیا تھا۔ خوبصورت اونچی اونچی عمارتوں کا ایک گھنا سا جنگل۔ اس علاقے میں مشہور پنج ستارہ موٹل تھے، ہوائی جہاز کمپنیوں، بڑے بڑے صنعت کاروں اور اخباروں کے دفاتر۔

عمارت کو ڈھونڈنے میں مجھے دقت نہیں ہوئی۔ وہ عمارت تمام عمارتوں میں سب سے بلند تھی اور دُور سے نظر آرہی تھی، مضبوط، پائیدار اور خوشنما۔

کچھ دیر میں باہر کھڑا اس عمارت کو نہارتا رہا۔ یہ عمارت — کہیں یہ میرا واہمہ تو نہیں۔ یہ

خیال مجھے کیوں آیا۔ شاید یہ میری ذہنی کیفیت کا نتیجہ تھا۔ میرے اندر بڑا ہیجان تھا۔ اگرچہ میں خود کو بڑا پرسکون ظاہر کر رہا تھا۔ اپنے غلیظ ماحول سے نکل کر یہ صاف ستھرا ماحول — یہ عمارتیں، یہ بسیں، یہ گاڑیاں، یہ چوڑی سڑکیں، یہ راہ گیر، سب واہمہ معلوم ہوتے تھے۔ یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ سب ممکن ہے۔

ایک بار پھر میں نے جیب میں احتیاط سے رکھے چیک کو نکال کر بغور دیکھا، پھر اس عمارت کو — اور چیک کو دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

شیشے کا دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ اندر کافی بھیڑ تھی۔ چار چار لفٹیں کام کر رہی تھیں۔ ہر لفٹ کے باہر دس بارہ آدمی قطار لگائے اپنی باری کے منتظر تھے۔

مجھے اٹھارویں منزل پر پہنچنا تھا۔ میں ایک لفٹ کے باہر لگی قطار میں کھڑا ہو گیا جو اس منزل پر رکتی تھی۔ اتنے سارے لوگ تھے، اور خاموشی سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

کیا ہر شخص کی جیب میں ایک چیک ہوگا؟ مجھے خیال آیا۔ میں نے سوچا اپنے آگے کھڑے آدمی سے پوچھوں۔ مگر خاموشی کی دبیز سطح کچھ اس طرح ماحول پر چھائی ہوئی تھی کہ میں اسے توڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ کسی معبد میں ہوں اور عبادت کا آغاز ہونے ہی والا ہو۔

بے آواز لفٹ نے پلک جھپکتے میں مجھے اٹھارویں منزل پر پہنچا دیا۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا جس کا نمبر مجھے دیا گیا تھا۔ کیشیر کا کاؤنٹر دیکھ میرا دل خوشی سے بھر گیا۔

معمر کیشیر جس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے بڑی مستعدی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ اس کا بھرا بھرا چہرہ اور سفید کلف لگی قمیض خوش حالی کے غماز تھے۔ کالر میں پھنسی سیاہ بو اس کے وقار اور خوش نمائی میں اضافہ کر رہی تھی۔ جب میں نے اپنا چیک شفاف شیشے کے کاؤنٹر کے نیم دائرہ شگاف سے اس کی طرف سرکایا تو اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر بے نیازی سے اس کی پشت پر کچھ لکھ کر ایک ٹوکن مجھے تھما دیا۔

میں ٹوکن لے کر کاؤنٹر کے سامنے دیوار کے پاس رکھے صوفے میں دھنس گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

پیتل کا خوش نما ٹوکن جس پر اب یاد نہیں کیا نمبر کھدا تھا نہ جانے میں نے کتنی بار الٹ پلٹ کے دیکھا ہوگا۔ کئی بار میں نے اسے انگلیوں سے مسلا بھی۔ بلکہ شاید گالوں سے لگا کر اس کی

ٹھنڈک بھی محسوس کی ۔ میری نظر بار بار کیشیر کے پیچھے لگی گھڑی کی طرف چلی جاتی ۔ پتہ نہیں کتنی دیر ہوگئی ۔ اس دوران میں نے نہ جانے کیا کیا سوچ ڈالا ۔ لیکن جب میں گھڑی کو دیکھتا تو معلوم ہوتا ابھی پانچ ہی منٹ ہوئے ہیں، ابھی دس ہی منٹ ہوئے ہیں ۔ یہ گھڑی کا سمک تو نہیں، جو کائناتی وقت بتا رہی ہو ۔

خوف محسوس ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب میں اس عمارت سے نکلوں تو معلوم ہو کہ کئی صدیاں بیت چکیں، حکومتیں بدل گئیں، لوگ بدل چکے اور میں کسی انجانے وقت میں اسیر حق دق کھڑا ہوا ہوں کہ کہاں جاؤں ۔

مجھے یاد ہے کہ ٹھیک جب میں یہ سوچ رہا تھا، کیشیر نے میرا نمبر پکارا تھا ۔ اور کئی لوگوں کو ہٹاتا میں کاؤنٹر کی طرف بڑھا تھا ۔ شاید میں کاؤنٹر پر پہنچا بھی تھا ۔ اور کیشیر نے مسکرا کر مجھ سے ٹوکن لیا تھا ۔ نہیں ابھی اس نے ٹوکن نہیں لیا تھا ۔ یا شاید لیا ہو ۔ ٹھیک سے یاد نہیں ۔ بہر حال عین اسی وقت باہر سے شور و غل کی آوازیں آنے لگی تھیں ۔ کیشیر نے تشویش کی ایک نگاہ دروازے پر ڈالی تھی اور کوئی کل دبائی تھی ۔ اس نے ضرور کوئی کل دبائی ہوگی، کیوں کہ میں نے کھٹکے کی آواز یقیناً سنی تھی ۔ شاید اس نے تجوری مقفل کر دی ہو، یا تمام تجوریاں مقفل کر دی ہوں ۔

لوگ باہر کی طرف متوجہ ہوئے تھے ۔ ایک نظر میں نے بھی دروازے پر ڈالی تھی ۔ پھر اُمید بھری نگاہوں سے کیشیر کو دیکھا تھا جو اب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا ۔

باہر شور و غل کی آوازیں بڑھتی چلی گئیں ۔ کمرہ دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہوگیا ۔ زینوں پر بہت سارے لوگوں کے چڑھنے اُترنے کی آوازیں آرہی تھیں ۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کیشیر بھی باہر چلا گیا ۔ میں کچھ حیران سا خالی کمرے کو تکتا رہا ۔ مجھے باہر کے ہنگامے سے کوئی غرض نہیں تھی ۔ میں کھڑکی کی طرف چلا گیا ۔ جب ہنگامہ فرو ہوگا، کیشیر تو آئے گا ہی ۔

میں نے کھڑکی سے جھانکا، دُور تک بس سمندر نظر آرہا تھا ۔ لہریں جوش و خروش سے ساحل کی طرف آتیں اور ٹکرا ٹکرا کر واپس لوٹ جاتیں، مگر ان کی آواز اُوپر نہیں پہنچتی تھی ۔

مجھے خیال آیا یہاں اور بھی تو عمارتیں تھیں، وہ کہاں گئیں؟ میں نے نیچے جھک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ایک گہری دُھند نے سب کچھ چھپا لیا تھا ۔۔۔ بے کیف ہو کر میں مڑا ۔ کاؤنٹر اب بھی خالی تھا ۔ گھڑی بدستور ٹِک ٹِک کر رہی تھی ۔

میں کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا ۔ ایک سادہ سا کاؤنٹر تھا بس ۔ اور چند کرسیاں ۔ وہ تجوری کہاں

تھی جس سے کیشیر کاغذ کے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر دے رہا تھا؟ میں نے بار بار جھک کر دیکھا۔ کاؤنٹر کے نیچے بھی۔ انگلیوں نے کسی کھٹکے یا سطح کی ناہمواری کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ سطح بالکل شفاف تھی۔ باہر شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آخر یہ ہنگامہ کب ختم ہوگا؟ کیشیر کب واپس آئے گا؟ آہستہ آہستہ چلتا میں دروازے پر آیا۔

زینوں کا ہنگامہ دیکھ کر میں حواس باختہ ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عمارت میں جمع تمام افراد زینوں پر آ گئے ہیں۔ کوئی نیچے اُتر رہا تھا اور کوئی اوپر چڑھ رہا تھا۔ پھر گرنے، پھسلنے، کچلنے کی صدائیں!

آخر ہوا کیا ہے؟ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا۔ مگر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ دوڑتے ہوئے کسی نے جواب دیا۔ بھئی تو بس یہ کہ دوڑو کچھ ہوگیا ہے۔

وہاں کھڑے رہنا مشکل تھا۔ شور سے سر پھٹنے لگا۔ کوئی بات ضرور تھی۔ کوئی بڑی افتاد تو کیا مجھے بلڈنگ سے نکل جانا چاہیئے؟ شاید یہی بہتر ہو۔ میں دوبارہ بھی تو آسکتا ہوں۔ مگر اب تو ٹوکن بھی میرے پاس نہیں۔ ہاں وہ خط جو میرے نام تھا اس پر چیک نمبر بھی تھا۔ یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔ بہرحال اب کسی صورت نکلنا تو ہوگا ہی۔

زینے سے کچھ دور کھڑا میں مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ ایک بار نیچے اُترنے والوں کا ریلہ آیا تو میں اس میں شامل ہوگیا اور کئی سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ پھر ایک موڑ پر اوپر آتے ہوئے لوگوں میں پھنس گیا اور ناچار واپس آیا۔

ایک بار پھر میں وہیں تھا، اٹھارویں منزل پر۔ لیکن اب میں بھیڑ میں شامل تھا جس سے الگ ہونا مشکل تھا۔ کئی بار میں نیچے اُترا اور کئی بار واپس آیا۔ ایک مرتبہ تو چوبیسویں منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں دم لینے کا تھوڑی دیر موقع ملا اور پھر وہی جدوجہد۔

ہر شخص بدحواس تھا۔ چیخ، پکار، شور، ہنگامہ۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میری طرح اور لوگ بھی پھنسے ہوئے تھے۔ کئی چہرے میں نے دیکھے کہ میرے ساتھ اُتر رہے تھے اور پھر دوسرے بہاؤ میں وہ اوپر جا رہے تھے ——

ایک بار میں پندرھویں منزل تک اُتر گیا۔ بڑی ہوشیاری سے میں نے خود کو علاحدہ کیا۔ راہداری میں کھڑے ہو کر میں نے اپنے کپڑے ٹھیک کیے، جو اب بالکل مُڑ تُڑ ہو چکے تھے اور پسینے سے چپچپا رہے تھے۔

کچھ دیر سستا کر ایک بار پھر قسمت آزمائی کے لیے میں سیڑھی پر آیا ہی تھا کہ عمارت کی ساری بتیاں گُل ہوگئیں۔ میں ٹھٹھک کر اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ ایک لمحے کو ساری عمارت میں سناٹا چھاگیا۔ ابھی کانوں کو اس راحت کا پوری طرح احساس ہوا بھی نہ تھا کہ مغلظات کا وہ طوفان برپا ہوا کہ الاماں۔ دماغ کی دھجیاں بکھر گئیں۔ کوئی دب گیا۔ کوئی کچل گیا۔ کچھ دیر بعد شور کم ہوا تو میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی سیڑھیوں پر چڑھنے اُترنے والوں کی تعداد میں یقیناً کمی ہوئی تھی۔

موقع غنیمت جان کر میں نے تیزی سے سیڑھیاں اُترنے کی کوشش کی۔ کئی لوگوں سے ٹکرایا، کسی کا پیر کچلا، کسی نے دھکا دیا، کہیں پیر رپٹا کسی نے گالیاں بکیں مگر میں کئی منزلے نیچے اُترنے میں کامیاب ہوگیا۔ شاید میں دو ایک منزلے اور اُتر جاتا مگر تب ہی روشنی آئی اور لوگوں نے چین کا سانس لیا۔

خوشی کے نعروں کے ساتھ سب ایک بار پھر زینوں پر پل پڑے۔ ہنگامہ اب پہلے سے کچھ زیادہ ہوگیا۔ اور لوگوں کا جوش و خروش بھی۔ اُوپر چڑھنے والے مجھے ٹھیلتے ہوئے ایک منزلہ اوپر لے آئے۔ اگر میں پوری قوت سے خود کو نہ سنبھالتا تو کچل جاتا۔

اب میں چیک، کیشیر اور دُوسری تمام باتیں بھول چکا تھا۔ اگر اس طرف خیال بھی جاتا تو بے ساختہ گالی منہ پر آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ چڑھنا، اترنا تو سدا سے جاری ہے۔ جو ایک بار ان سیڑھیوں پر آیا اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ شاید اس محنت کا کوئی حاصل نہیں تھا کوئی انجانی قوت ہم سے اس طرح کھیل رہی تھی جیسے بلّی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے۔ تھکان سے میرے پیر درد کر رہے تھے۔ جسم میں اتنی دُکھن تھی کہ بس۔ لیکن میں کب تک اس طرح کھڑا رہ سکتا تھا۔

ایک بار پھر وہی جدوجہد تھی اور میں۔ اوپر، نیچے، نیچے، اوپر۔ بس یہی احساس رہ گیا تھا۔ ذہن اس قدر تھک چکا تھا کہ تقریباً مفلوج ہو رہا تھا۔ اس لیے ایک بار جب میں نے خود کو گیارھویں منزل پر پایا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو کسی طرح سات منزلے طے تو ہوئے۔ باقی گیارہ منزلے بھی ہو سکتا ہے کبھی طے ہو ہی جائیں۔

ابھی میں نے یہ سوچا ہی تھا کہ روشنیاں ایک بار پھر غائب ہوگئیں۔ پھر وہی گالیاں، چیخ پکار۔ اُس لمحے اُداسی نے مجھ پر شب خون مارا۔ تم یہاں سے کبھی نکل نہ سکو گے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اب میری ہمت اور طاقت دونوں جواب دے جائیں گی مگر پھر روشنی آئی، اور ایک بار پھر میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

بڑی دیر بعد جب میں بھیڑ سے علاحدہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ اب میں آٹھویں منزل پر ہوں۔ دیوار پر لوگوں کے بھاگتے، ہانپتے، چیختے، چلاتے سائے عجیب بھیانک نقش بنا رہے تھے۔ جیسے وحشیوں نے کہیں حملہ کر دیا ہو۔ یا بھوت رقص کر رہے ہوں۔ سائے کبھی مضحکہ خیز معلوم ہوتے، کبھی بھیانک، کبھی ترحم آمیز اور کبھی ہیبت ناک۔

بھیڑ سے الگ ہو کر کچھ سکون ملا۔ کون احمق لوگ ہوں گے جنھوں نے یہ عمارتیں بنائیں۔ آخر ایسی اونچی عمارتوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب یہ اونچی عمارتیں نہ تھیں، کیا لوگ خوش نہ تھے۔ مجھے اب ان لوگوں پر بے حد غصہ آ رہا تھا جنھوں نے یہ عمارتیں بنائیں۔ کیا میں اس وسیع اونچی قبر میں دفن ہو جاؤں گا؟ مجھے رونا آ رہا تھا۔ آسمان، نیلا آسمان، کاش ایک بار پھر میں اسے دیکھ سکوں۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ میں اوپر لفٹ سے آیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ زینوں پر لوگوں کو اترتے چڑھتے دیکھ کر میں ایسے بوکھلایا، کہ بھول ہی گیا کہ میں لفٹ سے آیا تھا۔ میں دوڑ کر لفٹ کے پاس پہنچا۔ لفٹ تو کئی تھے۔ میں نے بٹن دبایا۔ مگر نہ کہیں بتی جلی نہ کوئی اشارہ ملا کہ لفٹ کس منزل پر ہے۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ شاید لفٹ آ رہی ہو۔ مگر بے سود۔ میں نے دوسری لفٹ کا بٹن دبایا۔ سارے ہی لفٹ دیکھ ڈالے۔ سب لفٹ بند تھے اور لفٹ آپریٹر غائب۔

ناچار، میں دوبارہ سیڑھیوں پر آیا۔ اور پھر وہی سلسلہ۔ نیچے، اوپر، اوپر، نیچے، شور، ہنگامہ، اندھیرا، روشنی، پرچھائیاں۔ نہ جانے کتنے جنم ان زینوں پر گزر گئے۔ ان زینوں پر چلتے چلتے میں بوڑھا ہو گیا۔ اور پھر جب میں بالکل ناامید ہو چلا تھا، ایک عجیب بات ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ میں بالکل نچلی سیڑھی پر ہوں۔ دروازہ سامنے ہے۔ دروازہ کھلا ہے، اجالا دروازے سے گزرتا، راہداری سے ہوتا، زینے کے سامنے چوکور فرش تک پہنچ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا سیڑھیوں پر ویسا ہی شور برپا تھا۔ دھپ دھپ لوگوں کے چڑھنے اترنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں اچانک اس صورت حال سے الگ ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ سامنے دن کی روشنی تھی۔ لیکن میں اس صورت حال کا اس قدر عادی ہو چلا تھا کہ اس روشنی سے مجھے اختلاج ہونے لگا۔

وہ آوازیں ـــ وہ آوازیں جیسے مجھے واپس بلا رہی تھیں۔ اونچی عمارت کسی دیو قامت مقناطیس کے مانند مجھے اپنے شکم میں کھینچنے لگی۔ میں واپس ان زینوں کی طرف دوڑ جاتا لیکن تب ہی مجھے خیال آیا نیلے آسمان کا۔ ایک بار ـــ بس ایک بار دیکھ تو لوں۔ آہستہ آہستہ خود کو

کھینچتا ہوا، اپنی قوتِ ارادی کو پوری طرح کام میں لاتے ہوئے بھاری قدموں سے میں باہر نکل آیا۔

باہر سکون تھا۔ زندگی معمول پر تھی۔ لوگ حسبِ معمول جی رہے تھے۔ دن کا حیات بخش اُجالا ہر شے کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ دور تک پھیلا نیلا آسمان آنکھوں کو طراوت دے رہا تھا۔ کچھ لوگ اس اُونچی عمارت کے باہر کھڑے عمارت سے برآمد ہوتی چیخوں، کراہوں اور شور کو حیرت سے سُن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس قدر شور کا سبب کیا ہے۔

میں بھی حیرت سے اس عمارت کو دیکھنے لگا۔

بمبئی

شہرنگاراں

جہاں زندگی، ہر صبح ایک نیا سپنا پلکوں پر سجا دیتی ہے

ساحل سمندر پر بسا خوب صورت شہر،

جس کی جگمگاتی روشنیاں،

ہر لحظہ ایک نیا خیرہ کُن سراب پیدا کرتی ہیں۔

سراب زدہ پھول جیسے لوگوں کی کہانی۔

**انور خان** کے منفرد قلم سے

جنہیں زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں کو، سادگی و پُرکاری، اختصار و دلچسپی

کے ساتھ خوب صورت نثر میں بیان کرنے کا ہُنر آتا ہے۔

یہ طرز، یہ اندازِ سخن ہم سے چلا ہے۔

ایک انتہائی غیر معمولی سماجی ناول

# پھول جیسے لوگ

قیمت: چالیس روپے

تخلیق کار پبلشرز

فراش خانہ

دھلی ۱۱۰۰۰۶

معیاری ادب کی دنیا میں ایک معتبر نام

## تخلیق کار پبلیشرز کی آئندہ اشاعتیں

- نیلام گھر (ناول) — مشرف عالم ذوقی
- دھند سے گھرا امکان (افسانے) — ولی محمد چودھری
- گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے) — علی امام نقوی
- لمحوں کی قید (افسانے) — کشور سلطانہ
- ڈاکو طے کریں گے (افسانے) — م۔ ناگ
- دو زاویے (شعری انتخاب) — انیس امروہوی
- وہ بھی اک زمانہ تھا (فلمی شخصیات) — انیس امروہوی
- قفس رنگ (غالب کی حیات و فن کا مطالعہ) — سید قدرت نقوی
- عظمتِ غالب (غالب کے فکر و فن کا مطالعہ) — سید قدرت نقوی

۱۰۴، فراشخانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶